مودودیات

فیروزالدین منصور

غلامی ، جاگیرداری اور سرمایہ داری کو
جائز قرار دینے کے مودودی نظرے کا
اسلامی تاریخ کی روشنی میں تجزیہ۔

★

قومی دارالاشاعت لاہور

مودودیت

غلامی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کو
جائز قرار دینے کے مودودی نظریئے کا
اسلامی تاریخ کی روشنی میں تجزیہ۔

فیروزالدین منصور

قومی دارالاشاعت
۳ — نسبت روڈ — لاہور
قیمت ۸ آنے

جماعت اسلامی کے اقتصادی مقاصد

جاگیرداری نظام

پاکستان کے محنت کش مظلوم عوام غیر ملکی سامراجیوں اور پاکستان کے بڑے بڑے تاجروں
اور جاگیرداروں کے حیاسوز، براہ راست اور وحشیانہ استحصال کے خلاف کھڑے ہو رہے
ہیں اور روٹی، روزگار، زمین اور جمہوری آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے
ہیں، اور اس جدوجہد کو بے اثر اور ناکام بنانے کے لئے بڑے بڑے سرمایہ داروں
اور جاگیرداروں کے تنخواہ دار مولوی بڑے زور شور سے یہ پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ "اسلام
بذات خود ایک الگ اور مکمل نظام حیات ہے" - اور اسلام کے نظام حیات اور کمیونزم
میں کوئی چیز مشترک نہیں. وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ "کمیونزم اور اسلام ایک دوسرے
کے دشمن ہیں اور کمیونزم کو مٹائے بغیر نہ اسلام قائم رہ سکتا ہے اور نہ مسلمان
زندہ رہ سکتے ہیں۔ پنجاب کے سرکاری مولوی ابوالحسنات، جماعت اسلامی کے امیر
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، اور مرزائیوں کے خلیفہ ثانی بشیر الدین محمود، غرضیکہ سب
اس بات پر اتفاق ہے۔

مگر ان "عالم دین" میں سے کسی نے بھی آجتک یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ موجودہ دور میں اس

نظام کی اقتصادی، سیاسی اور سماجی شکل کیا ہوگی جسے وہ اسلامی نظام کہتے ہیں۔

رجعت پسند سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی موجودہ برسر اقتدار جماعت مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے "عالم دین" ایک ہی سانس میں مختلف و متضاد باتیں کہتے ہیں۔ ایک طرف یہ مولوی کمیونزم پر اسلامی مساوات، جمہوریت اور اخوت کی بلندی اور برتری ثابت کرنے کے لئے اس جمہوریت مساوات اور اخوت کا تذکرہ کرتے ہیں جو رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد میں مدینہ میں تھی اور دوسری طرف بنو امیہ، بنو عباس، اور دوسرے مسلمان شاہی خاندانوں کے مطلق العنان اور جابر بادشاہوں کی مدح سرائی کرتے نہیں تھکتے، اور ستم ظریفی یہ کہ ان بادشاہوں کی فہرست میں چنگیز اور ہلاکو کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اور کمیونسٹوں کی اس بنا پر مذمت کرتے ہیں کہ وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کو ختم کر کے امیر و غریب کی تمیز مٹانے اور سب میں برابری قائم کرنے کی جد و جہد کر رہے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ اس قسم کی مساوات اسلام کے منافی" اور قدرت کے تقاضوں کے خلاف جنگ" کے مترادف ہے ایک طرف وہ خلفاء راشدین کے عہد میں اُس دور کا تذکرہ کرتے ہیں، جبکہ عراق، ایران، اور شام میں مسلمانوں کی فتوحات کے سبب مال غنیمت کی آمد اور مدینہ میں اس کی تقسیم سے کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ تھا، اور دوسری طرف "کمیونزم کی اسلام دشمنی" ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ "زکوٰۃ اور خیرات مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور اگر سب برابر ہو گئے، کوئی امیر و غریب نہ رہا، تو زکوٰۃ اور خیرات لینے والے نہیں ہونگے اور اسلام کی رو سے جو فرض مسلمانوں پر عائد ہے، اُسے مسلمان ادا نہیں کر سکیں گے۔" چنانچہ کمیونسٹوں کی یہ جد و جہد "مداخلت فی الدین" ہے۔

یہ علماء اپنے پیش رو برطانیہ پرست علماء کی طرح جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے کے ہر

جائز و ناجائز فعل کو اسلام کی رُو سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ شیخ الاسلام
مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولوی ابوالحسنات وغیرہ کے جاگیرداری نظام
اور پبلک سیفٹی ایکٹ کی حمایت میں فتوے اس بات کے بیّن ثبوت ہیں۔

پاکستان کے موجودہ برسرِاقتدار گروہ مسلم لیگ سے تعلق نہ رکھنے والے علماء میں سب سے
زیادہ منظم جماعت اسلامی والے ہیں جو خلافت راشدہ تک کے دَور کو صرف اسلامی حکومت
کا دَور تصوّر کرتے ہیں اور اس کے بعد تمام مسلمان شاہی خاندانوں کی حکومتوں کو غیر اسلامی
حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ مگر جہاں تک جاگیرداری اور بڑی زمینداری کا تعلق ہے، وہ
انہیں اسلامی قانون کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔ اس جماعت کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "قرآن کی آیت
الارض للّٰہ نام سے یہ حکم نکالنا کہ زمین کی شخصی ملکیت یعنی زمینداری ناجائز ہے، صحیح
نہیں۔ اسی طرح الارض للّٰہ سے یہ استنباط کہ زمین خدا کی ہے اور بندے اس
کے مالک نہیں ہو سکتے مضحکہ خیز ہے۔" اسی پر اکتفا نہیں وہ زمین کو بٹائی اور کرائے پر دینے
کی ممانعت کے متعلق احادیث کو صحیح مانتے ہوئے یہ کہہ کر مسترد کرتے ہیں کہ "مزارعت کی
حرمت اور بہ خود کاشتی کی قید اور بہ ملکیت زمین کے لئے رقبے کی حد بندی اسلام کے مجموعی
نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی۔" وہ بڑی زمینداری اور جاگیرداری کے اس قدر حامی
ہیں کہ تاریخی حقیقتوں کو بھی غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بڑی زمینداری
اور جاگیرداری جزیرۃ العرب میں عہد رسالت سے پہلے اور خلافت راشدہ کے عہد میں
بھی موجود تھی۔ تاریخی اعتبار سے یہ سراسر غلط ہے۔

صحرائے عرب بدو قبیلوں کی سرزمین ہے جو عہد رسالت سے پہلے چشموں کے قریب
چراگاہوں میں کھجور کے درختوں کے نیچے اونی کپڑے کے خیموں کی بستیوں میں رہتے، رات کے
وقت چاند کی چاندنی میں سفر کرتے اور مویشی چراتے، دودھ، گوشت اور کھجور پر زندگی بسر

کرتے اور قدیم زمانہ کے تمام صحرائی قبیلوں کی طرح چاند، سورج اور ستاروں، نیز چشموں، چراگاہوں، درختوں اور غاروں کو دیوی دیوتا سمجھ کر پرستش کرتے تھے۔ کنویں، چشمے، چراگاہیں کھجور کے درخت اور بعض قبیلوں میں مویشی بھی قبیلے کی مشترکہ ملکیت تھے مگر خیمے کے اندر کی چیزیں خاندان کی اپنی ملکیت تھیں۔

یمن حضر موت، عمان اور مغربی اور شمالی حجاز کے ان خطوں میں جو سمندر کے قریب ہیں اور جہاں بارش کبھی کبھی ہوتی رہتی ہے، زرعی بستیاں اور تجارتی شہر آباد ہو چکے تھے۔ مکہ جسے زمزم کے چشمے اور کعبہ کی وجہ سے مقدس مقام سمجھا جاتا تھا قریش تاجروں کا شہر تھا جو کعبہ کے پاسبان بھی گردانے جاتے تھے۔ مدینہ برعکس اس کے زرعی بستی تھا اور کسانوں، دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کا شہر تھا۔

صحرائے عرب میں جہاں آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی خوراک نیز چشموں اور چراگاہوں کے کم ہونے سے جائے رہائش کی قلت نے عرب قبیلوں کو یکے بعد دیگرے اپنا آبائی وطن چھوڑ کر مصر، بابل، شام اور فلسطین کو ہجرت کے لیے مجبور کیا، جہاں انہوں نے سب سے پہلی تہذیبوں کی بنیاد رکھی[1]۔ اور یہ خوراک اور جائے رہائش کی قلت ہی تھی جس نے ساحل سمندر کے

---

[1] ولادت مسیح سے تقریباً چار ہزار سال پہلے یمن کے علاقے سے کچھ صحرائی قبیلے خوراک کی تلاش میں جزیرۃ العرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے دریائے نیل کی زرخیز وادی میں پہنچے جہاں انہوں نے قدیم مصریوں سے کھیتی باڑی سیکھی اور پتھر کی عمارتیں تعمیر کیں نیز شمسی کیلنڈر رائج کیے۔ سب سے پہلی تہذیب کی بنیاد رکھی۔

اس خروج کے کچھ عرصہ بعد جنوبی عرب کے مشرقی حصوں سے کچھ یمنی عرب قبیلے دجلہ اور فرات کی زرخیز وادی میں پہنچے جہاں انہوں نے مہذب و متمدن سمریوں سے مکان بنانا اور اس میں رہنا، نیز کھیتی باڑی، آبپاشی اور لکھنا پڑھنا سیکھا۔ بابل کی قدیم تہذیب ان ہی یمنی عربوں کی تہذیب تھی۔ یہیں

قریب رہنے والے جنوبی عربوں کو مچھلی کا شکار کھیلنے کے لیے جہاز سازی اور جہاز رانی اور پھر سمندری تجارت کی طرف متوجہ کیا اور جو تہذیب قدیم کے تین بڑے مرکزوں یعنی ہندوستان عراق اور مصر کے درمیان بحری اور بری تجارت پر عربوں کا مکمل اجارہ قائم کرنے کا باعث بنی۔ اور یہی وہ تلخ حقیقت تھی جو صحرائے عرب کے قبیلوں کو ایک دوسرے سے چشمے، چراگاہیں اور مویشی چھیننے کے لیے قبائلی لڑائیوں میں مصروف رکھتی تھی۔

عراق اور ایران میں جہاں ساسانیوں کی حکومت تھی اور شام، فلسطین، مصر، اور

والی گاڑی اور ناپ تول کے پیمانے انہی کی ایجاد ہیں۔

ولادت مسیح سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے جنوبی عرب کے اس خطے سے کچھ قبیلے خوراک اور زرخیز وادی کی تلاش میں سفر کرتے ہوئے شام و کنعان کے زرخیز خطوں میں پہنچے۔ یہ فونیشی تھے جنہوں نے بحیرہ روم میں سب سے پہلے جہازرانی اور سمندری تجارت شروع کی۔ اس خروج کے تقریباً چھ سات سو سال بعد جنوبی عرب سے کچھ قبیلے دجلہ فرات کی زرخیز وادیوں میں آباد ہوئے کئی ناکام کوششوں کے بعد فلسطین پہنچ کر آباد ہوئے یہ یہودی تھے جنہوں نے مہذب دنیا کے سامنے ایک خدا کا عقیدہ سب سے پہلے رکھا۔

حضرت مسیح کی ولادت سے تقریباً سات سو سال پہلے شمالی عرب سے خروج کا دور شروع ہوا موجودہ شرق اردن کے قریب صحرا سے کچھ قبیلے کوہستان سینا کے شمال مشرق میں پھر آباد ہوئے، اور پہلے مصر اور اسکے بعد روم کی تہذیب سے متعارف اور متاثر ہو کر اپنی ایک الگ تہذیب یعنی قبطی تہذیب کو بام عروج پر پہنچایا۔ سبئی تاجر ہندوستان سے سوتی کپڑے بالخصوص ململ خوشبودار تیل اور مرچیں، خلیج فارس کے جزیروں سے موتیوں، چین سے ریشمی کپڑے، حبشہ سے ہاتھی دانت اور غلاموں اور اپنے ملک کے تانبے زیتون کے تیل اور لوبان کی تجارت، عراق، شام، مصر، ہندوستان اور حبشہ کے درمیان کرتے تھے۔ جنوب مغربی بندرگاہوں سے تاجروں کے قافلے مکہ اور مدینہ سے ہو کر قبطیوں کے دار الحکومت پیٹرا پہنچتے تھے اور وہاں سے ایک سڑک شام، دوسری فلسطین اور لبنان اور تیسری مصر کو جاتی تھی۔

شمالی افریقہ میں جہاں رومیوں کا اقتدار تھا، زرعی اور صنعتی پیداوار کا اکثر و بیشتر انحصار غلاموں کی محنت پر تھا۔ اور دیگر تمام آلات پیداوار کی طرح غلام بھی پیداوار کے اوزار اور مالکوں کی ذاتی ملکیت تھے۔ مگر صحرائے عرب میں جہاں خوراک اور جائے رہائش کی قلت تھی، اور جہاں غلاموں کی محنت سے فائدہ اٹھانے کے لئے عربوں کے پاس نہ زرخیز زمین کے بڑے بڑے قطعات اور نہ کارخانے تھے، عرب قبیلے اپنے دشمن قبیلوں کو شکست دینے کے بعد ان کی چراگاہوں، چشموں اور مویشیوں پر قبضہ کر کے ان کے خیموں کو لوٹ لیتے اور مردوں کو غلام بنا لینے کے بجائے انھیں قتل کر دیتے اور عورتوں کو جن کی تعداد صحرائے عرب میں مردوں کے مقابلے میں کم تھی اپنی لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ شہروں میں البتہ حبشی غلاموں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ یہ غلام یا تو ان کے گھروں میں کام کاج کرتے تھے یا عرب تاجروں کے جہازوں میں چپو چلانے کی محنت کیا کرتے تھے۔ جہاں تک ملک کی زرعی اور صنعتی پیداوار کا تعلق ہے شہروں میں بھی ان کا انحصار غلاموں کی محنت پر نہیں تھا۔ جزیرۃ العرب کے تینوں طرف ساحل سمندر کے قریب بارش والے خطوں میں جہاں زرعی بستیاں وجود میں آ چکی تھیں قابل کاشت زمین کے ٹکڑے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ چنانچہ وہ چھوٹے چھوٹے اور آزاد مالک کاشتکاروں میں بٹ چکے تھے۔ تم جہاں تک جاگیرداری یا بڑی زمینداری کا تعلق ہے وہ وجود میں نہیں آئی تھی۔ جاگیرداری کا نشو و نما یمن، حضرموت اور عمان کے خطوں[1] میں نہیں ہوا تھا۔ البتہ وہ چھوٹے چھوٹے کاشتکار جنھوں نے تجارت یا دستکاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا ان میں سے بعض اپنی زمین کو کرایہ یا بٹائی پر دوسرے کاشتکاروں

---

[1] یمن، حضرموت اور عمان میں تیرہ سو سال قبل مسیح سے ۶۵۰ قبل مسیح تک معینی خاندان کی حکومت، اس کے بعد ایک سو سال قبل مسیح تک سبائیوں اور پھر ۵۲۵ عیسوی تک بنو حمیر کی حکومت تاجروں کی حکومت تھی۔ غلاموں کے آقا جاگیرداروں کی حکومت نہیں تھی۔

کو دے دیتے تھے۔

پیغمبر اسلام کے عہد میں زمین کا مسئلہ بہت بڑا مسئلہ بن کر سامنے نہیں آیا۔ اور وہ اس لئے کہ تقریباً سارے کا سارا عرب صحرا ہے اور زرعی بستیوں کی اس میں حیثیت ساحل سمندر کے قریب چھوٹے چھوٹے جزیروں ایسی ہے۔ پیغمبر اسلام کے عہد میں مدینہ ہی صرف چار پانچ ہزار چھوٹے تاجروں، دستکاروں اور کاشتکاروں کی ایک بستی تھا جہاں زمین کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پیش ہوا۔

اسلام نے چشموں، کنوؤں، چراگاہوں، کانوں وغیرہ کی طرح زمین کو بھی نظری اعتبار سے خدا کی ملکیت یعنی ملت کی مشترکہ ملکیت قرار دیا اور پیغمبر اسلام نے جیسا کہ صحابہ کرام رافع بن خدیج، جابر بن عبد اللہ، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، زید بن ثابت اور ثابت بن ضحاک مروی ہیں زمین کو خریدنے یا قابل کاشت بنانے والوں کے حق ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ ہدایت کی کہ وہ اپنے پاس صرف اتنی زمین رکھیں جتنی کاشت کر سکتے ہیں۔ اور باقی زمین اپنے بھائی کو مفت کاشت کے لئے دے دیں مگر بٹائی یا کرایہ پر نہ دیں۔ غرضیکہ مدینہ میں پیغمبر اسلام نے زمین کو خدا کی ملکیت قرار دیتے ہوئے اسے قابل کاشت بنانے والے یا خریدنے والے کے حق ملکیت کو تسلیم کیا اور ساتھ ہی اس کے حقیقی کاشتکار کو زمین کی پیداوار کا مالک قرار دیا۔

زمین کا مسئلہ حقیقی طور پر بہت بڑا مسئلہ بن کر عربوں کے سامنے اس وقت آیا جب انہوں نے صحرائے عرب سے نکل کر دنیا کے زرخیز ترین خطوں مثلاً عراق، شام، فلسطین، مصر اور خراساں پر قبضہ کیا۔

پہلے دو خلفاء راشدین نے مسلمانوں کو جو اس وقت تک عموماً عرب تھے ایک فوجی تنظیم میں منظم رکھنے اور زمینوں پر قبضہ کر کے آباد ہونے سے روکنے کے لئے مفتوحہ ممالک میں زمینوں پر قبضہ کر لینے یا انہیں خریدنے کی خاص طور پر مخالفت کی چنانچہ پہلے دو خلفاء راشدین

کے عہد میں عربوں نے پرانی بستیوں اور شہروں سے باہر خیموں کے اپنے الگ شہر آباد کئے اور نہ کسی زمین کو خریدا اور نہ کسی زمین پر قبضہ کیا۔

عربوں کی فتوحات سے پہلے ساسانیوں اور رومیوں کی سلطنت کے زرخیز ترین خطوں میں زمین ساسانی اور رومی شاہی خاندانوں کے مجموعی، ان کے رشتہ داروں، درباریوں اور فوجی افسروں کی ملکیت تھی۔ اور اس کی کاشت ان کے غلام کرتے تھے۔

قدیم زمانے کی غلام شاہی سلطنتیں اس وقت تک مضبوط و مستحکم رہیں، جب تک ان کے سپہ سالار دوسرے ملکوں کو فتح کر کے وہاں سے دولت اور غلام حکمرانوں کے لئے لاتے رہے، مگر فتوحات کا دور ختم ہونے سے جب دولت اور غلاموں کی آمد رک گئی تو غلام شاہی سماج زرعی و صنعتی تنزل اور تجارتی و مالی بحران کے دور میں داخل ہوئی۔ اور غلاموں اور ان کے آقاؤں کے درمیان طبقاتی جنگ تیز ہو جانے سے آخری ہچکیاں لینے لگی۔ عہد صحابت سے پہلے روم و ایران کی قدیم غلام شاہی سلطنتوں کی یہی کیفیت تھی۔ وہ مرض الموت میں مبتلا اور چند دن کی مہمان تھی۔

جس طرح بربر قبیلوں نے شمال اور شمال مشرق سے حملے کر کے روم قدیم کی غلام شاہی سماج کو یورپ میں درہم برہم کیا تھا، اسی طرح عربوں نے عراق و ایران میں ساسانیوں اور شام، فلسطین، لبنان اور مصر میں رومیوں کے غلام شاہی نظام حکومت کو ختم کیا۔

ایک طرف ایران و روم کی زوال پذیر غلام شاہی حکومتوں کی شکست اور دوسری طرف عربوں کے مفتوح ممالک میں زمینوں پر قبضہ کرنے کی ممانعت سے زرعی نظام میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی۔ زمینوں اور غلاموں کے مالک ساسانی اور رومی حکمرانوں کے مارے جانے، مغلوب ہونے یا بھاگ جانے سے حقیقی کاشتکار غلام اور زرعی غلام آزاد ہو کر زمینوں کے مالک بن گئے۔ پہلے دو خلفاء راشدین کے عہد میں عربوں کے مقابلے میں روم و ایران کی قدیم سلطنتوں کے ریت کی دیوار کی طرح گرنے کا سبب یہی زرعی اصلاحات تھیں۔

مگر زرعی اصلاحات کا یہ دور عارضی تھا جو حضرت عثمان کے عہد میں ختم ہو گیا۔ ایک طرف دولت اور لونڈی غلاموں کی کثرت نے اور دوسری طرف عراق، ایران، شام، فلسطین اور لبنان کی خوبصورتی اور زرخیزی نے عرب مجاہدوں کے جوش جہاد کو رفتہ رفتہ ٹھنڈا کر کے انھیں دنیا کے ان زرخیز ترین خطوں میں آباد ہونے کی خواہش کو بڑھا دیا۔ عرب شیوخ اور سرکردہ مجاہدین نے حضرت عمر کے عہد میں ہی مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ مفتوحہ ممالک میں عربوں کو زمینوں پر قبضہ کرنے اور انھیں خریدنے کی اجازت دیجائے مگر انھوں نے اجازت نہیں دی۔ اموی اُمرا سے تعلق رکھنے والے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان نے البتہ جہاں کلیدی محکمے اور عہدے اپنے قریبی رشتہ دار اموی امرا کے حوالے کر دیئے وہاں ان کے زور دینے سے عربوں کو مفتوحہ ممالک میں زمینوں پر قبضہ کرنے اور عالیشان محلوں میں رہنے کی بھی اجازت دے دی۔ کئی ایک صحابہ کرام بالخصوص حضرت ابوذر غفاری نے اس بات کی شدید مخالفت کی۔ مگر حضرت عثمان نے اس مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حضرت ابوذر غفاری کو مدینہ سے کچھ دور ربزہ میں نظر بند کر دیا۔

زمینیں اور جاگیریں حاصل کر کے زرخیز ترین علاقوں میں آباد ہونے کی طرف رجحان بڑھنے سے فتوحات کا پہلا دور حضرت عمر کی وفات (سنہ ۶۴۴ء) کے تین چار سال بعد ہی ختم ہو گیا۔ صحرائے عرب سے جہاں خوراک اور جائے رہائش کی قلت اور آبادی بڑھ رہی تھی یکے بعد دیگرے قبیلے نکل کر دوسرے علاقوں میں آباد ہونے لگے اور چالیس پچاس سال کے عرصے میں صحرائے عرب میں آبادی بہت کم رہ گئی۔

سے ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابو عبیدہ کی سپہ سالاری میں عرب مجاہدین شام و فلسطین کو فتح کر کے جب لبنان پہنچے اور اسے قبضہ میں لے لیا تو اس ملک کے خوبصورت باغات کو دیکھ کر یہ عرب نے کہا کہ جس جنت کا خدا نے وعدہ کیا تھا وہ یہی ہے" اور فتوحات کو آگے جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔

زمینیں اور جاگیریں عطا کرنے کا سلسلہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں شروع ہوا اور اموی
نروں اور فوجی افسروں نے خود زمینوں پر قبضہ کرکے اور قبائلی سرداروں اور سرکردہ
ہدین کو زمینیں اور جاگیریں عطا کرکے تھوڑے ہی عرصہ میں جاگیرداروں امیر تاجروں
رجاہ پسند گورنروں اور فوجی افسروں کا ایک ایسا با اثر اور مضبوط طبقہ پیدا کر دیا جس
علویوں اور زبیریوں کے خلاف بنو امیہ کو برسر اقتدار لانے میں بڑا حصہ لیا۔

پہلے دو خلفاء راشدین نے عراق، ایران، شام اور فلسطین کے کاشتکاروں اور
ی غلاموں کو ان کے ساسانی یا رومی آقاؤں کی غلامی سے آزاد کرکے زمینوں کا
لک بنا دیا۔ اور اس نے وہی خراج (مالیہ زمین جو پیداوار کے ایک مقررہ حصہ کی
ں میں حکومت وصول کرتی تھی) وصول کرنے کا فرمان جاری کیا جو ان علاقوں کے
ک کاشتکار رومی یا ساسانی حکومتوں کو ادا کرتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد سے زمینیں
ر جاگیریں ملنے سے عربوں میں جو جاگیردار پیدا ہوئے وہ مالک نہیں تھے۔ حکومت نے
یں مخصوص علاقوں یا ضلعوں میں کاشتکاروں سے خراج وصول کرکے اپنے ذاتی استعمال
یں لانے اور حکومت کو اس میں سے کوئی حصہ نہ دینے کا حق دیا تھا۔ نظری اعتبار سے زمین
کی ملکیت تصور کی جاتی تھی، مگر پیغمبر اسلام کے خلیفہ اور ملک کے فرمانروا کی حیثیت سے
کی طرف سے زمینوں کا مالک خلیفہ وقت تھا۔ چنانچہ خلیفہ وقت آج کسی کو اگر کسی علاقہ یا
لع کا خراج وصول کرنے کا حق عطا کرتا تھا تو کل ناراض ہو کر اس سے یہ حق چھین بھی لیتا
تھا۔ مثلاً پچاس لاکھ درہم سالانہ وظیفہ اور ایران کے ایک ضلع کا خراج وصول کرنے کا
ق قبول کرکے امام حسنؓ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے مگر یہ حق
موی تاجداروں نے بعد میں امام حسنؓ کے خاندان سے چھین لیا۔

بنو امیہ کے دور میں عربوں کے نظام حکومت میں زوال پذیر قبائلی سماج اور روبہ تنزل
نظام شاہی اور روبہ عروج جاگیرداری تینوں کی اقتصادی، سیاسی اور سماجی خصوصیات

موجود تھیں۔ یہ ایک عبوری دور تھا اور آمدنی کے وسیلے بہت محدود تھے۔

آمدنی کا ایک وسیلہ مالِ غنیمت تھا۔ دشمنوں کا تمام مال متاع حتیٰ کہ وہ خود، ان کی عورتیں، اور فوجی سپاہی سب مالِ غنیمت تھے۔ اس مالِ غنیمت کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے چار حصے مالِ غنیمت ان مجاہدوں میں تقسیم کیا جاتا تھا جنھوں نے فتح حاصل کرکے سب مال و متاع لوٹا ہوتا اور باقی ایک حصہ قومی خزانہ یعنی عملی طور پر فرمانروا کو بھیجا جاتا تھا۔ حضرت عثمان کے بعد فتوحات کا سلسلہ رک جانے سے عربوں اور ان کی حکومت دونوں کی اس وسیلے سے آمدنی گھٹنی شروع ہوئی۔ منڈیوں میں غلاموں اور کنیزوں کی آمد اور خرید و فروخت بھی رک گئی اور اس سے تجارتی بحران پیدا ہوگیا۔

دوسرا وسیلہ خراج تھا جو مسلم اور غیر مسلم سب کاشتکاروں سے حکومت وصول کرتی تھی۔ حضرت عثمان کے عہد سے عرب کے ریگستان سے بہت بڑے پیمانے پر عربوں نے نکل کر عراق، ایران، شام، فلسطین اور مصر میں آباد ہونا شروع کیا اور بنو امیہ نے خلافت کے دوسرے دعویداروں یعنی اوّل حضرت علی کے فرزندوں اور پھر حضرت زبیر کے فرزند عبداللہ کے مقابلوں میں عربوں کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرکے انھیں شکست دینے کے لئے لاتعداد قبائلی سرداروں اور کئی ایک صحابیوں کو جاگیریں دے کر خراج وصول کرنے کے حق دے دیئے۔ جس سے اس وسیلے سے حکومت کی آمدنی بھی رفتہ رفتہ گر گئی۔

تیسرا وسیلہ جزیہ کے نام سے وہ سرکاری ٹیکس تھا جو غیر مسلموں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کرنے کے صلہ میں وصول کیا جاتا تھا۔ کچھ تبلیغ سے، کچھ جزیہ کی ادائیگی سے معافی حاصل کرنے کی غرض سے اور کچھ وہ حقوق و مراعات حاصل کرنے کے لئے جو مسلمانوں کو حاصل تھے جب غیر مسلم بہت بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنے لگے تو اس وسیلے سے آمدنی بھی لگاتار کم ہونے لگی۔

آٹھویں صدی عیسوی کے شروع ہونے سے پہلے فوج اور نظم ونسق کے محکموں کے مصارف اموی شہزادوں اور شاہی خاندان کے ممبروں، گورنروں اور اعلیٰ سرکاری افسروں کی تنخواہوں اور وظیفوں نیز وظیفہ لینے والے قبیلوں اور قبائلی سرداروں کی تعداد بڑھنے سے حکومت کے اخراج بڑھ رہے تھے اور آمدنی کم ہو رہی تھی۔ مال غنیمت کی آمد رک جانے سے عربوں کی آمدنی گھٹ رہی تھی اور منڈیوں میں غلاموں اور کنیزوں کی آمد گھٹ جانے سے تجارتی بحران بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ اموی حکمرانوں نے تجارتی بحران اور مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے حسب ذیل قدم اٹھائے!

۱۔ آٹھویں صدی کے شروع میں یعنی پانچویں اموی خلیفہ عبدالمالک (۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) کے عہد میں شام میں آباد یمنی عربوں، عراق میں آباد حجازی عربوں نیز شمالی افریقہ کے بربر قبیلوں کے افراد پر مشتمل تنخواہ دار فوج کے بل بوتے پر فتوحات کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں قتیبہ بن مسلم نے ۷۰۶ء میں دریائے آموں پار کر کے دس سال کے عرصہ میں دریائے سیحون تک تمام وسط ایشیا کو فتح کر لیا۔ محمد بن قاسم نے ۷۱۱-۱۵ء میں بلوچستان اور سندھ کو فتح کیا اور ۷۱۳ء میں سلطنت بنوامیہ کی حدود ملتان تک وسیع کر دیں اور موسےٰ بن نصیر اور طارق نے ۷۱۱ء میں جنگ شروع کر کے ۷۳۲ء تک مغربی افریقہ اور سپین کو بنوامیہ کی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۲۔ خلیفہ الولید اول (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) نے مالی مشکلات پر قابو پانے کے لئے جاگیرداروں سے خراج کا کچھ حصہ بطور مالیہ لینا شروع کیا اور جاگیرداروں نے اس ٹیکس کا بوجھ خراج کی شرح بڑھا کر مسلم اور غیر مسلم کاشتکاروں کے کندھوں پر ڈال دیا۔

۳۔ الولید اول کے گورنر حجاج بن یوسف نے عراق اور ایران میں عربوں کے علاوہ باقی سب کو جزیہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ خراج کی شرح میں اضافہ سے کاشتکاروں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ جزیہ ادا کرنے کے حکم نے غیر مسلم اور غیر عرب مسلم کی تمیز کو ختم کر کے سب کاشتکاروں کو

جزیہ اور خراج دونوں کو ادا نہ کرنے کی بنیادوں پر متحد کر دیا۔ حجاج بن یوسف نے خراج اور جزیہ وصول کرنے کے لیے تعزیری فوج بھیجی جس نے عراقی کاشتکاروں کی بغاوت کو دبانے کے لیئے لاکھوں کاشتکاروں کو ہلاک اور ہزاروں کو گرفتار کر کے جیل میں قید کر دیا۔ تحریک انتہائی تشدد کے باوجود سات آٹھ سال جاری رہی اور امن اس وقت قائم ہوا جب آٹھویں اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیز (۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی جیل میں قید کاشتکاروں کو رہا کر دیا، مسلمانوں سے جزیہ کی وصولی منسوخ کر دی، اور کاشتکاروں سے خراج وصول کرنے کے جاگیر نامے اور سندیں اپنے عزیز اقارب، شاہی خاندان کے ممبروں درباریوں فوجی افسروں اور قبائلی سرداروں سے لے کر پھاڑ دیئے۔

مگر جاگیرداری سے نجات کا یہ دور عمر بن عبد العزیز کی وفات کے فوراً ہی بعد ختم ہو گیا اور نویں اموی خلیفہ یزید ثانی (۷۲۰ء تا ۷۲۴ء) اور دسویں خلیفہ ہشام (۷۲۴ء تا ۷۴۳ء) کے عہد میں جاگیرداروں کو ان کے حقوق اور جاگیر نامے پھر مل گئے۔ فرق صرف یہ ہوا کہ عرب اور غیر عرب نیز مسلم اور غیر مسلم کاشتکاروں اور جاگیرداروں سے زرعی پیداوار کا جو مقررہ حصہ بطور مالیہ حکومت وصول کرتی تھی وہ خراج کہلانے لگا اور پیداوار کا جو مقررہ حصہ کاشتکاروں سے جاگیردار وصول کرتے تھے اسے مالکانہ، کرایہ، بٹائی، لگان وغیرہ کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ چنانچہ کاشتکاروں سے کرایہ بٹائی لینے کے سوال پر فقیہوں میں بحث کا آغاز ہوا۔

امام مالک (۷۱۵ء تا ۷۹۵ء) نے جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور جنھوں نے تمام سیاسی اور مذہبی متنازعہ فیہ مسائل کو حل کرنے نیز فقہ کو مرتب کرنے کے لیئے رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد میں اہل مدینہ کی عملی زندگی کو سامنے رکھا تھا، کاشتکاروں سے کرایہ یا بٹائی لینے کی مخالفت کی۔ یہی رائے امام ابو حنیفہ (سال وفات ۷۶۷ء) کی تھی جو ایک ایرانی غلام کے پوتے، کوفہ کے ایک تاجر کے فرزند اور امام حسن بصری کے شاگرد تھے اور جنھوں نے آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح نیز احادیث کی صداقت کو پرکھنے اور فقہ مرتب کرنے کے لیئے

عقل اور استدلال پر زیادہ زور دیا تھا۔ کاشتکاروں سے بٹائی لینے کی مخالفت امام شافعی نے بھی کی جو امام مالک کے شاگرد تھے اور جنھوں نے جہاں حدیث مبہم اور غیر واضح ہو وہاں قیاس و استدلال کو جائز قرار دیا تھا۔ مگر بنو عباس کے عہد میں جاگیرداری نظام اس قدر مضبوط ہو چکا تھا کہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد اور پانچویں عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بغداد کے قاضی القضات امام ابو یوسف نے حنفی فقہ کو ترتیب دیتے ہوئے جاگیرداروں کے کاشتکاروں سے پیداوار کا ایک مقررہ حصہ بطور لگان یا بٹائی لینے کو جائز قرار دیتے ہوئے فقہ کی اُس پر مُہر ثبت کر دی۔

عباسیوں کے دورِ خلافت میں فقیہوں نے جس چیز کو فقہ میں اپنایا وہ جاگیرداری نظام تھا جو ساری دنیا میں اُبھر رہا تھا، اور جو ایران، عراق اور شام، مصر وغیرہ میں حقیقت بن چکا تھا۔ انہوں نے کاشتکاروں سے بٹائی یا لگان لینے کے حق کو تسلیم کیا۔ جاگیرداروں کو زمینوں کا مالک قرار نہیں دیا۔ زمین بدستور خدا کی ملکیت رہی۔ اسے کسی کی ذاتی ملکیت قرار نہیں دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مغربی استعمار پرستوں کے تسلط سے پیشتر نہ صرف ایران، عراق، شام، مصر بلکہ تمام ایشیاء میں زمین کے ذاتی ملکیت ہونے کا تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ نہ اسے کوئی بیچ سکتا تھا۔ زمین ہندوستان میں بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ گاؤں کی پنچایت ہر کسان کو اس کی خاندانی ضرورت کے مطابق زمین دینے، گاؤں کا سارا انتظام کرنے، دستکاروں کو رواج کے مطابق پیداوار کا مقررہ حصہ دینے، گاؤں کے باشندوں کے باہمی جھگڑے نپٹانے اور سارے کے سارے گاؤں کی طرف سے ملک کے فرمانروا کو ملک کے قانون یا رواج کے مطابق پیداوار کا مقررہ حصہ مالیہ کی حیثیت سے ادا کرنے کے فرائض ادا کرتی تھی۔ زمین وسیع تھی۔ لہٰذا اسے زیرِ کاشت لانے میں ملک کا کوئی قانون، کوئی رواج، کوئی اخلاق اور کوئی مذہبی عقیدہ مانع نہ تھا۔

زمین کسی کی ملکیت نہ تھی۔ البتہ اس کی پیداوار کے دو حصہ دار تھے۔ ایک کاشتکار اور دوسرا ملک کا فرمانروا جو مالیہ وصول کرتا تھا۔ ہندوؤں کے عہد میں مالیہ کل پیداوار کے بارھویں حصے سے چھٹے حصے تک تھا۔ اور شہنشاہ اکبر کے وزیر ٹوڈرمل نے کل پیداوار کا ایک تہائی حصہ مقرر کیا تھا۔

انگریزی تسلط سے قبل جاگیرداروں کا وجود نہ پنجاب میں تھا اور نہ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں۔ البتہ کاشتکاروں اور ملک کے فرمانروا کے درمیان وفادار راجواڑوں، نوابوں، اور خانوں، شاہ کے خیرخواہ اور پرانے خدمت گار افسروں، دیوانوں اور قبائلی سرداروں کا ایک طبقہ تھا۔ جو فرمانروا کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے علاقہ کا انتظام اور حفاظت بھی کرتا تھا۔ اور کاشتکاروں سے مالیہ وصول کر کے اس میں سے کچھ مقامی ضرورتوں (حفاظت نظم ونسق اور تعمیر عامہ مثلاً عبادت گاہوں، نہروں، قلعوں، فصیلوں وغیرہ کی تعمیر) کے لئے مقامی خزانہ میں جمع کر کے باقی فرمانروا کو بھیج دیتا تھا۔

ان تینوں میں زمین کا حقیقی مالک کون ہے۔ اس بات کا تصفیہ جدید سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ یورپ میں وہ تین سو سال پہلے ہو چکا تھا۔ ایشیا میں ابھی نہیں ہوا تھا چنانچہ زمین ہندوستان اور تمام ایشیا میں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی۔ اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ اس کی کوئی ساکھ نہ تھی۔

مگر انگریز حکمران سابقہ تمام حکمرانوں سے جدا خصوصیات رکھنے والے حکمران تھے۔ وہ جدید قسم کے تاجر تھے۔ ان کا مقصد برطانوی کارخانوں کے لئے کچا مال خریدنا اور انگلستان کے کارخانوں کی تیار شدہ اشیاء کو اس ملک میں فروخت کرنا تھا۔ ہمارے وطن کا قدیم خود کفیل دیہاتی نظام ان کے اس مقصد کی کامیابی میں حائل ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اسے درہم برہم کر کے اپنے مفاد کے مطابق ایک خاص نظام یعنی نوآبادیاتی نظام قائم کیا۔

پہلے مالیہ کی ادائیگی گاؤں کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ اس اعتبار سے زمین گاؤں یا قبیلہ

کی مشترکہ ملکیت تھی۔ نئے حکمرانوں نے مالیہ ادا کرنے کی ذمہ داری افراد کے کاندھوں پر ڈال
کر گاؤں یا قبیلہ کی مشترکہ ذمہ داری ختم کر دی۔ زمین کو ذاتی ملکیت بنانے کی طرف یہ پہلا
قدم تھا۔ پہلے مالیہ کل پیداوار کا ایک مقررہ حصہ تھا اور عموماً جنس کی شکل میں ادا کیا
جاتا تھا۔ انگریز حکمرانوں نے رقبہ اور زمین کی زرخیزی کو مالیہ کی بنیاد بنایا اور نقد
روپوں کی ادائیگی کو قانوناً لازمی اور عدم ادائیگی کو جرم مستوجب ضبطی زمین قرار دیا۔ روپیہ
اس زمانہ میں شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا۔ جو کسان مالیہ ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتے
تھے وہ اپنے قبائلی سرداروں اور سابقہ اور نئی حکومت کے سرکاری افسروں کے مزارعے
بن گئے۔ چنانچہ قبیلوں کے قبیلوں اور گاؤں کے گاؤں کی مشترکہ زمین ان قبائلی سرداروں
سابقہ حکومتوں کے ملازموں اور افسروں، پیروں اور سجادہ نشینوں کے قبضہ میں چلی
گئیں۔ جنھوں نے سابقہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر کے نئے حکمرانوں کی ملک فتح کرنے
میں مدد کی، یا سرکش قبیلوں کو دبانے میں انگریزوں کا ہاتھ بٹایا۔ نیز نئی حکومت کے ان
سرکاری افسروں کو مل گئیں جنھوں نے عوام کے خلاف حکومت کی بڑی خدمت کی۔ چنانچہ
تاریخ شاہد ہے کہ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں آج جو بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار
ہیں، ان کو یہ جاگیریں اور زمینیں انگریزوں سے انعام میں ملی ہیں۔ انہوں نے وطن
فروشی کی۔ انگریزوں نے انھیں انعام دیا۔

عوام کو ایک پس ماندہ نوآبادیاتی نظام کی زنجیروں میں جکڑنے نیز اپنے اس نظام کو
عوامی غصہ کے پرشور طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لئے انگریزوں کو ہندوستانیوں کے ایک
حصہ کی سرگرم اور وفادارانہ حمایت و امداد درکار تھی۔ چنانچہ انھوں نے زمانہ گذشتہ کی
باقیات (راجے، نواب، قبائلی سردار، پچھلے حکمرانوں کے افسر، پیر، سجادہ نشین وغیرہ) نیز اپنے
خدمت گاروں، وفاداروں اور عوام دشمن عناصر میں سے جاگیردار پیدا کر کے انھیں اپنی
حکومت اور نوآبادیاتی نظام کا ستون بنایا اور زمین (خدمات کے صلہ میں مربعہ جات مخصوص

مراعات (مثلاً ٹوانوں اور نونوں کو اپنی نہریں جاری رکھنے اور کاشتکاروں سے کل پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ آبیانہ وصول کرنے نیز تمام جاگیرداروں کو اپنے مزارعوں سے مختلف قسم کے جاگیرشاہی ٹیکس وصول کرنے کی مراعات) خطابات اور سندیں (جو مقامی افسروں سے رعایات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں) اور اختیارات (نمبرداری، ذیلداری، آنریری مجسٹریٹی وغیرہ) دیکر اور ان کے پڑھے لکھے بیٹوں اور بھتیجوں کو فوج، پولیس، مال، نہر اور دیگر سرکاری محکموں میں اونچے اونچے عہدے دے کر مصنوعی طریقہ پر قائم رکھا ہے۔

مغربی پنجاب اور اسی طرح سندھ، صوبہ سرحد، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے حقیقی مالک اور حکمران یہی جاگیردار اور بڑے زمیندار ہیں۔ مثلاً مغربی پنجاب کے ساڑھے تیرہ لاکھ موجودہ مالکان اراضی میں سے دس ایکڑ سے کم زمین کے مالک گیارہ لاکھ تینتیس ہزار اور پانچ ایکڑ سے کم زمین کے مالک نو لاکھ سے اوپر ہیں۔ مگر اس صوبہ کی زیر کاشت تقریباً دو کروڑ ایکڑ زمین میں سے مجموعی طور پر ان کے قبضہ میں بالترتیب ۳۳ لاکھ اور ۱۰ لاکھ ایکڑ زمین ہے۔ برعکس اس کے پانچ سو ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالک ساڑھے سات ہزار سے کم ہیں۔ مگر مجموعی طور پر زمین ان کے قبضہ میں . . . . . . ۲۶ لاکھ ایکڑ ہے۔ مغربی پنجاب کے حقیقی مالک اور حکمران یہی چھ سات سو زمینداروں اور جاگیرداروں کے خاندان ہیں۔ دس ایکڑ سے کم زمین رکھنے والے تقریباً گیارہ لاکھ مالک، مہاجر کاشتکاروں کے تقریباً پانچ لاکھ خاندان جنھیں غیر مسلم کی زمینوں پر آباد کیا گیا ہے، علاوہ ان کے مزارعوں اور کھیت مزدوروں کے تقریباً پانچ لاکھ خاندان نیز مہاجر اور غیر مہاجر دیہاتی کاشتکاروں کے تیرہ چودہ لاکھ خاندان ہیں، یہ سب کے سب غرضیکہ پوری کی پوری دیہاتی آبادی غلام ہے۔

پہلے یہ بڑے زمیندار اور جاگیردار یونینسٹ پارٹی کے ممبر اور ستون تھے، اب مسلم لیگ کے ہیں، پہلے صرف زمیندار اور جاگیردار تھے اب ان میں سے کئی ایک نے غیر مسلم کی آڑھت کی دکانوں تجارتی فرموں، اور کارخانوں پر بھی قبضہ کر لیا ہے، ہماری دیہاتی اقتصادیات پہلے ہی

ان کے قبضہ میں تھی، اب قصباتی اقتصادیات بھی انھیں کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔

جس خطۂ زمین کے چند ہزار بڑے زمیندار اور جاگیردار چالیس فیصدی زمین کے مالک ہوں اور پیداوار میں کوئی سرمایہ اور کوئی محنت صرف کرنے کے بغیر اپنی زمین کی پیداوار کے تقریباً دو تہائی حصہ کے مالک بن جاتے ہوں، جس خطۂ زمین کے چوبیس لاکھ حقیقی کاشتکار خاندانوں میں سے تقریباً گیارہ بارہ لاکھ کے پاس زمین اتنی کم ہو کہ خاندان کا پیٹ نہ پال سکیں، جس خطۂ زمین کے گیارہ لاکھ مزارعہ اور مہاجرہ کاشتکار خاندانوں کو خون پسینہ ایک کرنے کے علاوہ اخراجات کا سارا بوجھ برداشت کر کے بھی ایک تہائی پیداوار سے کم نصیب ہوتی ہو، جس خطۂ زمین کے تیرہ چودہ لاکھ دیہاتی دستکار بے روزگاروں کی صف میں ہوں۔ جس خطۂ زمین کے زمیندار اور جاگیردار آڑھتی اور تاجر بن کر ذخیرہ بازی، چور بازاری اور نفع خوری میں غیر مسلم آڑھتیوں اور تاجروں کو بھی شرمندہ کر رہے ہوں، اور جس خطۂ زمین کے زمیندار و جاگیردار کارخانوں کے مفت میں مالک بن کر صنعت کو فروغ دینے کے بجائے مزدوروں کا خون چوس کر اور مشینیں فروخت کر کے دولت جمع کر رہے ہوں، اس خطۂ زمین کی زراعت، تجارت، اور صنعت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس خطۂ زمین کے عوام کبھی خوش حال نہیں ہو سکتے۔ اور فوج رکھنے کے باوجود اپنے ملک کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جاگیرداری نظام جو ایک ہزار سال پہلے ترقی پسندانہ نظام تھا اس وجہ سے اس نے غلامی کے نظام کی جگہ لی تھی، آج اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی ترقی کے راستہ میں پہاڑ بن کر کھڑا ہے۔ اس پہاڑ کو گرائے یعنی جاگیرداری اور بڑی زمینداری کو بلا معاوضہ منسوخ کرنے اور زمینوں کو ان کے حقیقی کاشتکاروں میں مفت تقسیم کرنے کے بغیر ہم ترقی کی طرف ایک قدم نہیں بڑھ سکتے۔

مگر مولانا مودودی کسی حکومت یا کسی مجلس قانون ساز کو اجتماعی بہتری کے لیے بھی جاگیرداروں کے مالکانہ حقوق کو چھیننے یا ان میں کمی بیشی کرنے کو شرعاً ناجائز اور ظلم قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں!

"جو لوگ جاگیرداری کو ناجائز ٹھہرا کر اس کے انسداد پر زور دیتے ہیں وہ اسلامی قانون کی حدود سے باہر قدم رکھتے ہیں۔" (تسنیم ۲۶ر جون ۱۹۵۰ء)

مولانا مودودی نہ صرف بڑی زمینداری اور جاگیرداری کو اسلامی قانون کے عین مطابق سمجھتے ہیں، بلکہ قدیم زمانہ کے جاگیرداری نظام کی دوسری "برکتوں" مثلاً جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے، ان کی خرید و فروخت کرنے اور بلاتعداد لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کی بھی حمایت کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے متعلق جماعت اسلامی کے اس تصور اور مطمح نظر پر روشنی مولانا مودودی نے ایک چھٹی میں ڈالی ہے جو نومبر ۱۹۴۸ء کے "طلوع اسلام" اور ۲۶ر جولائی ۱۹۵۰ء کے روزنامہ "امروز" میں شائع ہوئی تھی۔ سلہ

غرضیکہ جماعت اسلامی کے قائم کردہ اسلامی نظام حکومت میں بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو نہ صرف کسانوں اور مزارعوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو ہڑپ کرنے بلکہ لونڈی غلام خریدنے اور فروخت کرنے اور بلاتعداد لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کا بھی حق ہوگا۔

سلہ مولانا مودودی سے کسی نے پوچھا تھا کہ جماعت اسلامی جو اسلامی نظام حکومت قائم کرنا چاہتی ہے کیا اس میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی اجازت ہوگی، کیا ان لونڈی غلاموں کو فروخت کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگی، اور اس پر تعداد کی کوئی قید تو نہیں ہوگی۔ اس استفسار کے جواب میں مولانا مودودی نے جو چھٹی لکھی ہے اس کا خلاصہ یہی ہے کہ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانا اور ان کی خرید و فروخت کرنا اور بلاتعداد لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کرنا شریعت حقہ کے تقاضوں میں سے ہے اور اسلام کے لئے وجہ فخر ہے۔

سرمایہ داری نظام

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی یوں تو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کی مذمت کرتے ہیں مگر جو اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام "اسلام کے نظام حیات" کے نام سے ایک "متوسط راہ" کے طور پر پیش کرتے ہیں، وہ کوئی دوسری راہ نہیں۔ وہی راہ ہے جس پر سرمایہ دار اور جاگیردار گامزن ہیں۔ انھیں سرمایہ داری سے نہیں صرف اشتراکیت سے دشمنی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے کے خلاف دو انتہائی نقطوں پر ہیں۔ سرمایہ داری افراد کو ان کے فطری حقوق ضرور دیتی ہے مگر اس کے اصول و نظریات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو افراد کو جماعت کے مشترک مفاد کی خدمت کے لئے آمادہ کرنے والی اور بحد ضرورت اس پر مجبور کرنے والی ہو۔ بلکہ درحقیقت وہ افراد میں ایک ایسی خود غرضانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے جس سے ہر شخص اپنے شخصی مفاد کے لئے جماعت کے خلاف عملاً جنگ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تقسیم ثروت کا توازن بالکل بگڑ جاتا ہے۔ ایک طرف چند خوش نصیب افراد پوری جماعت کے وسائل ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں اور اپنے سرمایہ کی قوت سے مزید دولت کھینچے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف جمہور کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے اور دولت کی تقسیم میں ان کا حصہ گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اشتراکیت اس خرابی کا علاج کرنا چاہتی ہے مگر وہ ایک صحیح مقصد کے لئے غلط راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس کا مقصد تقسیم ثروت میں توازن قائم کرنا ہے۔ اور یہ بلاشبہ صحیح مقصد ہے مگر اس کے لئے وہ ذریعہ ایسا اختیار کرتی ہے جو درحقیقت انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کرکے بالکل جماعت کا خادم بنا دینا نہ صرف معیشت کے لئے تباہ کن ہے بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لئے مہلک ہے۔ کیونکہ یہ چند معاشی کاروبار اور نظام

تمدن سے اس کی روح رواں، اس کی اصلی قوت محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ تمدن اور معیشت میں انسان کو جو چیز اپنی انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر اُبھارتی ہے وہ دراصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔ .... اسلام ان دو متضاد معاشی نظاموں کے درمیان ایک معتدل نظام قائم کرتا ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ فرد کو اس کے پورے پورے شخصی اور فطری حقوق بھی دیئے جائیں اور اس کے ساتھ تقسیم ثروت کا توازن بھی نہ بگڑنے دیا جائے۔ ایک طرف تو وہ فرد کو شخصی ملکیت کا حق اور اپنے مال میں تصرف کرنے کے اختیارات دیتا ہے اور دوسری طرف وہ ان سب حقوق اور اختیارات پر باطن کی راہ سے کچھ ایسی اخلاقی پابندیاں، اور ظاہر کی راہ سے کچھ ایسی قانونی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ وسائل ثروت کا غیر معمولی اجتماع نہ ہو سکے۔ ثروت اور اس کے وسائل ہمیشہ گردش کرتے رہتے ہیں اور گردش ایسی ہو کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا مناسب حصہ مل سکے .... اس قسم کا طرز معیشت اگرچہ کسی کو کروڑ پتی بننے سے نہیں روک سکتا۔ مگر اس کے ماتحت یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کروڑ پتی کی دولت اس کے ہزاروں ابنائے نوع کی فاقہ کشی کا نتیجہ ہو۔ دوسری طرف یہ طرز معیشت تمام افراد کو خدا کی پیدا کی ہوئی دولت میں سے حصہ ضرور دلانا چاہتا ہے۔ مگر ایسی مصنوعی بندشیں لگانا جائز نہیں رکھتا جس کی وجہ سے کوئی شخص اپنی قوت و قابلیت کے مطابق اکتساب مال نہ کر سکتا ہو۔"

("سود" مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، صفحات ۱۱۔ تا ۱۵)

موجودہ سرمایہ داری نظام کی بنیادیں وسائل پیداوار (زمین، کارخانے، اوزار، مکانات، باغات وغیرہ) کی شخصی ملکیت اور دولت کمانے کی کامل آزادی پر ہے۔ سرمایہ پرست فلاسفروں، مفکروں اور سیاست دانوں کی طرح مولانا مودودی بھی شخصی ملکیت اور دولت کمانے کے حقوق کو انسان کے فطری حقوق قرار دیتے ہیں اور ان حقوق سے محروم کرنا ان کے نزدیک "انسانی فطرت سے جنگ" ہے۔ وہ مالکانہ حقوق کا "احترام" کرتے

ہیں اور کسی حکومت یا کسی مجلس قانون ساز کو اجتماعی بہتری کے لئے بھی ان مالکانہ حقوق کو چھیننے
یا ان میں کمی بیشی کرنے کو شرعاً "ناجائز" اور "ظلم" قرار دیتے ہیں۔ ("اسلام کا نظامِ حیات"
مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ باب "اسلام کا اقتصادی نظام")

جدید سرمایہ داری سماج کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظام نیز ان کے قائم کئے ہوئے
اخلاق، تہذیب، فلسفے اور قوانین کی بنیاد وسائل پیداوار پر یہی مالکانہ حقوق ہیں۔ اور
مولانا مودودی تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ داری نے افراد کو ان کے یہ "فطری حقوق" دے رکھے ہیں

مگر یہ مالکانہ حقوق "ابدی" اور "فطری حقوق" اس لئے نہیں کہ ہماری تہذیب کے
ابتدائی ادوار میں وسائل پیداوار شخصی ملکیت نہیں بلکہ مشترکہ ملکیت تھے۔ عہدِ رسالت
سے پہلے عربوں میں بھی چشمے، چراگاہیں، کھجور کے درخت حتیٰ کہ بعض قبیلوں میں مویشی بھی
پورے قبیلوں کی مشترکہ ملکیت تھے۔ شخصی ملکیت کا تعلق "انسانی فطرت" سے نہیں بلکہ
وسائل پیداوار کے اوزاروں اور وسیلوں میں ایک خاص ترقی اور تبدیلی سے ہے۔

سرمایہ داری کے دور میں سائنس کے نئے نئے انکشافات اور مشینوں کی ایجادات
سے پیداوار کے اوزار اور وسیلے اس قدر بدل گئے ہیں کہ انھیں انفرادی طور پر استعمال
میں لاکر چیزیں تیار نہیں کی جا سکتیں۔ پہلے ایک ہاتھ ایک چیز تیار کرتا تھا اب نہ صرف ایک
مقام اور نہ ہر ایک ملک، بلکہ کئی ملکوں کے کئی کئی ہاتھ مل کر ایک چیز تیار کرتے ہیں۔ چنانچہ ہماری
معیشت کی بنیادیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ پہلے کسان اپنے کھیتوں، دستکار اپنے اوزاروں
اور چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں اور تاجر اپنی تجارتی دکانوں کے مالک تھے، اب بڑے زمیندار
اور سرمایہ دار بڑی تیزی سے انھیں ان کی زمینوں، مکانوں، اوزاروں، ورکشاپوں
اور تجارتی دکانوں سے محروم کر کے ایسے مزدوروں کی صف میں شامل کر رہے ہیں جن کے
پاس اپنی طاقت محنت کے علاوہ بیچنے کو اور کچھ نہیں۔ سرمایہ داری کی بنیادیں شخصی ملکیت
پر ہیں، اگرچہ پیداوار کے سب وسیلے مٹھی بھر دولتمندوں کی ملکیت بن گئے ہیں اور باقی ۹۸

فیصدی آبادی پیداوار کے وسیلوں کی ملکیت سے محروم ہو چکی ہے۔ کمیونسٹوں کا "جرم" یہ ہے کہ وہ اُن دو فیصدی اشخاص کو وسائل پیداوار کی ملکیت سے محروم کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنے سرمایہ کی قوت سے ۹۸ فیصدی اشخاص کو ذاتی ملکیت سے محروم کر دیا ہے۔ وہ حقوق ملکیت چھیننا نہیں چاہتے بر عکس اس کے وسائل پیداوار کو سب کی یعنی اجتماعی ملکیت بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ محنت کش عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی نفع کی شکل اختیار کر کے اُن چند لوگوں کی جیبوں میں نہ جائے جو کوئی کام نہیں کرتے بلکہ اُس کمائی سے سب کا معیار زندگی بلند ہو اور سب کو روٹی اور روزگار میسر ہو جماعتِ اسلامی انسانیت اور موجودہ دور کے ان تقاضوں کے خلاف ہے۔ وہ ۹۸ فیصدی آبادی کو پیداوار کے وسیلوں کی ملکیت سے محروم کرنے والے دو فی صدی دولتمندوں سے وسائل پیداوار کی ملکیت چھیننے کو "شرعاً ناجائز" اور "ظلم" قرار دیتی ہے۔ اور مولانا مودودی کہتے ہیں کہ "افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے بالکل جماعت کا خادم بنا دینا نہ صرف معیشت کے لئے تباہ کن ہے بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لئے مہلک ہے۔" مولانا مودودی انسان کو فطری طور پر "خود غرض" سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں۔

"تمدن و معیشت میں انسان کو جو چیز اپنی انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر اُبھارتی ہے وہ در اصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔ یہ انسان کی فطری خود غرضی ہے جس کو کوئی منطق اُس کے دل و دماغ کے ریشوں سے نہیں نکال سکتی غیر معمولی افراد کو چھوڑ کر ایک اوسط درجہ کا آدمی اپنے دل اور دماغ اور دست و بازو کی تمام طاقتیں صرف اُسی کام میں خرچ کرتا ہے اور کر سکتا ہے جس سے اُس کو خود اپنے مفاد کے لئے ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر سرے سے یہ دلچسپی ہی باقی نہ رہے اور اس کو معلوم ہو کہ اس کے لئے فوائد و منافع کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے اس سے بڑھ کر وہ اپنی جد و جہد سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گا تو اس کے قوائے فکر و عمل ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔"

(سود۔ مصنف۔ سیّد ابو الاعلیٰ مودودی۔ صفحات ۱۲ اور ۱۳)

مولانا مودودی کے اِن خیالات و تصورات کا منبع قرآن و احادیث نہیں بلکہ یورپ کے سرمایہ پرست فلسفیوں کا "نظریۂ انفرادیت" ہے۔ ان فلسفیوں نے جدید سرمایہ داری کے عہد میں خاندانی رشتوں سمیت تمام رشتوں، ذاتی جوہر، مذہب، اخلاق اور سیاست میں نفع کے لئے لین دین کی کسوٹی اپنائی اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان فطری طور پر خود غرض ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کائنات کے دوسرے تمام مظاہر کی طرح انسانی فطرت بھی ساکن اور جامد نہیں۔ وہ ماحول کے زیر اثر ہے اور اس کے بدلنے کے ساتھ ہی ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

قدیم قبائلی دور میں جبکہ پیداوار کے وسیلے اول پتھر کے اوزار اور بعد میں تیر کمان تھے اگر انسان قدرت کی طاقتوں اور جنگلی جانوروں کا مشترک طور پر مقابلہ نہ کرتے تو ان کے لئے زندہ رہنا ناممکن تھا۔ جنگل سے پھل جمع کرنے، رہنے کے لئے گھاس پھونس اور پتوں کا گھر بنانے نیز جنگلی جانوروں اور ہمسایہ اجنبی قبیلوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے انسانوں کا مل جل کر رہنا اور کام کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ چنانچہ ساتھ مل کر کام کرنے سے پیداوار کے اوزار اور ان اوزاروں کی مدد سے مشترک محنت کا پھل دونوں مشترکہ ملکیت تھے۔ قدیم قبائلی معاشرہ کی بنیاد وسائل پیداوار کی مشترکہ ملکیت پر تھی۔ اور انسانوں کے باہمی تعلقات، اخلاق، عقائد اور رسم و رواج اس بنیاد کو مضبوط و مستحکم کرتے تھے۔ انفرادی ملکیت کا نام و نشان بلکہ تصور تک نہ تھا۔ ہر فرد کا ذاتی مفاد قبیلے کے مجموعی مفاد سے وابستہ اور اس میں مدغم تھا۔ عربوں کے مشہور شاعر امراء القیس کا یہ شعر جس کے معنی "قبیلے کے مفاد پر اپنا ذاتی مفاد قربان کر دو، حتیٰ کہ اپنی محبوبہ کو بھی چھوڑ دو" ثابت کرتا ہے کہ مشترکہ مفاد، مشترکہ ملکیت، مشترکہ دشمن اور ریگستان کی کٹھن دشوار زندگی کے باعث عہد رسالت سے پہلے صحرائے عرب کے قدیم بدو قبیلوں میں بھی قبیلے سے باہر یا اس کے مقابلے میں فرد کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

آگ اور دھاتوں کی دریافت اور اس کے بعد سائنس کے نئے نئے انکشافات کی

بنیادوں پر نئی نئی ایجادوں سے پیداوار کے اوزار بدلنے اور ان کے ساتھ ہی ساتھ پیداواری تعلقات بدلنے شروع ہوئے۔ اور ذاتی ملکیت کے نشوونما سے قدیم اشتراکی سماج مخالف طبقوں میں بٹ کر درہم برہم ہو گئی۔

سرمایہ داری کے عہد میں نفع کمانے کے لئے اشیاء کی پیداوار اور انکی خرید و فروخت نے پرانے جاگیری، پدری قبیلی، اور دیہاتی رومانوی تعلقات کو ختم کر کے خاندانی رشتوں سمیت تمام رشتوں کو خالص تن پروری اور محض لین دین کے رشتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ خود غرضی جو آج ہم میں پائی جاتی ہے اور ہر روز بڑھ رہی ہے سرمایہ داری نظام پیداوار کے مخصوص ماحول کا منطقی نتیجہ ہے۔ اشتراکی سماج میں چونکہ وسائل پیداوار سب کی ملکیت ہوں گے اس لئے افراد کے ذاتی مفاد اور سب کے مشترکہ مفاد میں کوئی تضاد نہیں ہوگا۔ دونوں مفاد ایکدوسرے میں مدغم ہوں گے۔

مولانا مودودی "معاشی زندگی میں ہر فرد کے شخصی مفاد کا تمام افراد کے اجتماعی مفاد سے گہرا ربط[1] چاہتے ہیں، مگر "کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتے جو فرد کو جماعت میں گم کر دے اور اس کے لئے وہ آزادی باقی نہ چھوڑے جو اس کی شخصیت کے صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے[2]۔" غرضیکہ وہ کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتے جو زرداروں کے لئے دوسروں کی محنت غصب کر کے دولت کمانے کی آزادی باقی نہ چھوڑے۔ وہ سماج میں کروڑپتیوں اور ناداروں کی موجودگی بھی چاہتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے یہ بھی چاہتے ہیں کہ دونوں کے مفاد میں اتحاد اور یکساں جہتی ہو۔ یہ خواہش صرف مولانا مودودی کی نہیں ہر سرمایہ دار کی ہے۔

جماعت اسلامی کے علماء باتیں وہی کہتے ہیں جو جدید علوم سے ناواقف دقیانوسی قسم

---

[1] سود۔ صفحہ ۱۴ [2] اسلام کا نظام حیات صفحہ ۳۸

کے مولوی زرداروں کی حمایت میں کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی طرزِ تحریر جدید ہے۔ اور وہ جدید سائنٹیفک اصطلاحات کو بڑی عیارت سے غلط مصرف کے لئے مسخ کر کے استعمال کرتے ہیں۔ پرانی قسم کے مولوی امیری اور غریبی کو خدا کی طرف سے منسوب کر کے "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد" کی دلیل پیش کرتے ہیں اور مولانا مودودی اسلام کے اقتصادی نظام کی وضاحت فرماتے ہوئے "رزق میں مساوات" کو "غیر فطری" اور "زبردستی کی مصنوعی مساوات" قرار دے کر اس کی مذمت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو۔ لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کیلئے اختیار کی جائیں۔ ۔ ۔ ۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جد و جہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فطرت سے قریب تر نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(اسلام کا نظام حیات صفحہ ۴۶)

مولانا مودودی نے اول تو یہ دعویٰ کیا کہ اسلام حصول رزق کی جد و جہد کے مواقع میں مساوات کا حامی ہے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس دعوئے کی منطق جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو منسوخ کرنے کی طرف لے جاتی ہے تو فوراً اس کی روک تھام یوں کی کہ ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ یہ "حصول رزق کی جد و جہد کے مواقع میں مساوات" تو نہیں ہوئی۔ اگر راجے کا ایک ملازم یا گاؤں کا ایک مزارعہ "معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے" کرتا ہے "جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے" تو کیا اسے اس دوڑ میں اصفہانی، نواب کالا باغ، ایوب کھوڑو، یا مرا تب علی اور دولتانہ کے مقابلہ میں حصول

رزق کی جدوجہد کے "مساوی مواقع حاصل ہوں گے۔

مولانا مودودی کے نزدیک اسلامی مساوات ہزارہا ایکڑ زمین کے مالک ایک جاگیردار کو جو ایک پیسہ خرچ کئے بغیر گھر بیٹھے اپنی زمین کی کل پیداوار کے دو تہائی حصہ سے زیادہ کا مالک بن جاتا ہے اور اس کے مزارعہ کو جو دس بارہ ایکڑ زمین کاشت کے لیے لے کر اپنی گرہ سے خرید کر بیج ڈالتا ہے اور اپنے مویشیوں کی مدد سے خون پسینہ ایک کر کے زمین کی کاشت کرتا ہے۔ مگر پیداوار کے ایک تہائی حصہ سے زیادہ کا مالک نہیں بن سکتا ــــــ دونوں کو معیشت کے میدان میں اپنے اپنے مقام سے دوڑ کی ابتدا کرنے اور دولت کمانے میں ایکدوسرے سے سبقت لے جانے کا پورا موقع دیتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

"جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے، وہ موٹر ہی پر چلے۔ جو صرف دو پاؤں لایا ہے۔ وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کر دے ......" (ایضاً صفحہ ۴۴)

مولانا مودودی کے نزدیک یہ ہے حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع کی اسلامی مساوات! معیشت کے میدان میں "کھلی اور بے لاگ" دوڑ جسے مولانا مودودی نے "حصولِ رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات" کا نام دیا ہے، نظام سرمایہ داری میں اب بھی موجود ہے۔ نظری اعتبار سے جاگیردار اور مزارعہ سرمایہ دار اور مزدور غرضیکہ ہر فرد و بشر کو معیشت کے میدان میں دوڑ لگانے کا حق حاصل ہے۔ مگر کیا یہ ممکن ہے۔ نہیں عملی طور پر تو اس "دوڑ" میں امیر زیادہ امیر اور غریب زیادہ غریب ہو رہے ہیں۔ محنت و مشقت کرنے کے باوجود سماج کے نچلے طبقوں یعنی نچلے درمیانہ طبقوں، دستکاروں، مالک کاشتکاروں اور چھوٹے تاجروں کے مکان، زمینیں، چھوٹے چھوٹے کارخانے اور دیگر وسائل پیداوار انکے قبضہ سے نکل کر چند دولت مندوں کے قبضہ میں جا رہے ہیں۔

جس قسم کی "مساوات" کو مولانا مودودی "اسلامی مساوات" کہتے ہیں وہ اب بھی موجود ہے۔ مگر اس "مساوات" نے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۹ء تک متحدہ برطانوی پنجاب

میں بیس[1] ہزار کے قریب مالک کاشتکاروں کو اپنی زمینیں فروخت کر کے مزارعوں اور کھیت مزدوروں کی صف میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ حالانکہ اس عرصہ میں اس صوبہ کی زیر کاشت زمین میں تقریباً بیس[2] لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں یہ "مساوات" پچاس ایکڑ تک زمین کے مالکوں کے قبضہ سے ۴۳[3] لاکھ ایکڑ زمین بھی نکالنے کا باعث بنی حالانکہ انکی تعداد میں بارہ[4] ہزار کا اضافہ بھی ہوا۔ برعکس اس کے اس "مساوات" نے اس عرصہ میں پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالکوں کی تعداد بتیس[5] ہزار کے قریب کم کر دی مگر جو پچاس ایکڑ سے زیادہ زمین کے مالک رہے ان کے قبضہ میں ۴۲[6] لاکھ ایکڑ زمین کا اضافہ کر دیا۔

"مساوات" ایک طرف دولت اور پیداوار کے تمام وسیلوں کو چند ہاتھوں میں مرکوز کر رہی ہے اور دوسری طرف مفلسی، ناداری اور بے روزگاری کو عوام میں پھیلا رہی ہے۔

کمیونسٹوں کا مساوات کے متعلق نظریہ مختلف ہے۔ سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی سترویں کانگریس کی رپورٹ میں سٹالین نے ان کے نظریہ کی اچھی طرح وضاحت کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"مساوات سے مارکسزم کی مراد انفرادی ضرورتوں اور انفرادی زندگی میں یکسانیت اور مساوات نہیں ہے بلکہ طبقات کو ختم کرنا ہے یعنی (۱) سرمایہ داروں کا تختہ الٹنے اور ان کے املاک کو ضبط کرنے کے بعد تمام محنت کشوں کو مساوی طور پر لوٹ کھسوٹ سے نجات دلانا۔

---

[1] ۳۵ لاکھ سے ۴۴ لاکھ ۸۰ ہزار

[2] دو کروڑ ۹۰ لاکھ سے تین کروڑ دس لاکھ ایکڑ

[3] دو کروڑ پندرہ لاکھ ایکڑ سے ایک کروڑ ۷۲ لاکھ ایکڑ۔

[4] ۳۳ لاکھ ۸۴ ہزار سے ۳۲ لاکھ ۹۶ ہزار۔

[5] ایک لاکھ پندرہ ہزار سے ۸۳ ہزار

[6] ۷۵ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ سے ایک کروڑ ۱۷ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ۔

(۲) پیداوار کے ذرائع کو (زمین، فیکٹری اور کارخانے، جنگل، معدنیات اور دریا وغیرہ۔ مترجم) پوری سوسائٹی کی ملکیت میں بدلنا (اب تک ذرائع پیداوار سرمایہ دار ملکوں میں ذاتی ملکیت میں مترجم) اور پھر ذرائع پیداوار کی حد تک ذاتی ملکیت کو سب کے لئے مساوی طور پر منسوخ کرنا۔ (۳) اپنی قابلیت کے مطابق کام کرنا سب کا مساوی فرض ہوگا اور تمام محنت کشوں کو انکے کام کی مقدار کے مطابق معاوضہ پانے کا مساوی حق حاصل ہوگا (یہ سوشلسٹ سوسائٹی میں ممکن ہوگا) (۴) اپنی قابلیت کے مطابق کام کرنے کا مساوی فرض اور تمام محنت کشوں کو اپنی ضرورتوں کے مطابق معاوضہ پانے کا مساوی حق (یہ کمیونسٹ سوسائٹی میں ممکن ہوگا) مزید یہ کہ مارکسزم اس مفروضے کو مان کر آگے بڑھتا ہے کہ لوگوں کے مذاق اور ان کی ضرورتیں (نہ صفات اور نہ مقدار میں) یکساں اور مساوی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ نہ سوشلزم کے دور میں اور نہ کمیونزم کے دور میں!" یہ ہے مساوات کا مارکسی تصور ــــــ مارکسزم نے کسی دوسری قسم کی مساوات کو کبھی تسلیم نہیں کیا ہے اور نہ آج تسلیم کرتا ہے

"اس سے (یعنی مساوات کے مارکسی تصور سے۔ مترجم) یہ نتیجہ نکالنا کہ سوشلزم یکسانیت اور برابری چاہتا ہے، سوسائٹی کے تمام افراد کی ضرورتوں کو برابر کر دینا چاہتا ہے، انکے مذاق اور ان کی ذاتی زندگیوں کو یکساں اور ہموار کر دینا چاہتا ہے ــــ یعنی مارکسسٹوں کی تجویز ہے کہ سب لوگ ایک ہی سے کپڑے پہنیں اور ایک جیسا کھانا کھائیں اور وہ بھی مساوی مقدار میں ــــ ایسی باتیں کہنا بیہودہ گھٹیا ذہنیت کا ثبوت دینا ہے اور مارکسزم کو بدنام کرنا ہے۔

وقت آگیا ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ مارکسزم ہمواریت (EQUALISATION) کا دشمن ہے۔ کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس نے کمیونسٹ مینی فسٹو میں بھی پرانے خیالی سوشلزم پر کڑی تنقید کی اور اسے رجعت پسند کہا کیونکہ خیالی سوشلزم "عالمگیر قلندری اور انتہائی بھونڈے قسم کی سماجی ہمواریت" کا پرچار کرتا تھا۔ اینگلس نے اپنی کتاب قاطع ڈوہرنگ

میں ایک پورا باب " انقلابی ہمواریت پسند سوشلزم " کی رد پر صرف کیا ڈوہرنگ نے مارکسی سوشلزم کے جواب میں ہمواریت پسند سوشلزم کی تلقین کی تھی۔ اینگلس نے لکھا ہے کہ مساوات کے پرولتاری مطالبے کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ طبقات کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ مساوات کا کوئی دوسرا مطالبہ جو اس مطالبے کے آگے جائے لغو ہے "

لینن نے بھی یہی بات کہی ہے۔ " اینگلس نے یہ بالکل صحیح کہا کہ مساوات کا کوئی تصور جو طبقات کو ختم کرنے سے تجاوز کرے ایک احمقانہ اور لغو تعصب ہے۔ اس ضمن میں سرمایہ دار عالموں نے ہم پر یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کہ ہم سب لوگوں کو ایک دوسرے کے برابر کرنا چاہتے ہیں سرمایہ دار عالموں نے خود ہی مساوات کا یہ جاہل تصور باندھا اور اب وہ اس کا الزام ہم پر تھوپتے ہیں —— لیکن اپنی جہالت کے باعث وہ یہ نہ جان سکے کہ سوشلسٹوں نے —— جدید علمی سوشلزم کے بانیوں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس نے —— کہا ہے کہ اگر مساوات کے معنی طبقوں کے خاتمے کے نہ ہوں تو مساوات ایک کھوکھلا لفظ ہے۔ ہم طبقات کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم مساوات کے علمبردار ہیں لیکن یہ دعوے کہ ہم سب لوگوں کو ایک دوسرے کے برابر کرنا چاہتے ہیں ایک کھوکھلا دعوی ہے۔ سرمایہ دار دانشوروں کے ذہن کی ایک احمقانہ ایجاد ہے —— "

(لینن کی تقریر " آزادی اور مساوات کے نعروں کے ذریعہ لوگوں کو دھوکا دینا " کا اقتباس

(لینن ازم کے مسائل :۔ از استالن صفحہ ۳-۲-۵ مطبوعہ ماسکو ۱۹۴۷ء ایڈیشن ۶)

مولانا مودودی زرداروں کی معاشرت و معیشت میں " بے لگامی " اور دولت کے چند ہاتھوں میں سمٹاؤ کی مذمت کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے اس بات پر بھی بار بار زور دیتے ہیں کہ " اسلامی طرز معیشت کسی کو کروڑپتی بننے سے نہیں روکتا۔ " آپ فرماتے ہیں کہ اسلامی طرز معیشت " کچھ ایسی اخلاقی اور قانونی پابندیاں عائد کرتا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ وسائل ثروت کا غیر معمولی اجتماع نہ ہو سکے ثروت اور اس کے

وسائل ہمیشہ گردش کرتے رہیں۔ اور گردش ایسی ہو کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا متناسب حصہ مل سکے۔" یہ اخلاقی، مذہبی اور قانونی پابندیاں سود کی ممانعت، زکوٰۃ، خیرات، حج اور جائداد کی ورثا میں تقسیم ہیں۔

گذشتہ چودہ سو سال سے یہ اخلاقی، مذہبی اور قانونی پابندیاں مسلمانوں پر عائد ہیں مگر مسلمان زرداروں کی معاشرت و معیشت میں "بے لگامی" اور وسائل پیداوار کو چند ہاتھوں میں مرکوز ہونے سے نہیں روک سکیں۔ مولانا مودودی خود تسلیم کرتے ہیں کہ "ایک طرف چند خوش نصیب افراد پوری جماعت کے وسائل ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن رہے ہیں اور اپنے سرمایہ کی قوت سے مزید دولت کھینچتے جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف جمہور کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہو رہی ہے اور دولت کی تقسیم میں ان کا حصہ گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ گیا ہے۔" اس کا سبب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تاریخی ادوار کے تقاضے پورے ہو کر رہتے ہیں۔ اول جاگیرداری اور پھر سرمایہ داری کے دور میں معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے کروڑ پتیوں کا وجود اور دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹاؤ بہت ضروری تھا، چنانچہ زرداروں کی معاشرت و معیشت میں "بے لگامی" اور وسائل پیداوار کے چند ہاتھوں میں سمٹاؤ کے خلاف پہلے زمانے کی اخلاقی، مذہبی اور قانونی پابندیاں کارگر نہ ہوئیں۔

مگر اب حالات بدل گئے ہیں، ہماری معاشرت و معیشت کی بنیادیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جس طرح ایک زمانے میں غلامانہ نظام زندگی سماج کو ترقی کی چند منزلوں میں رہنمائی کرنے کے بعد اس کی آگے ترقی کے راستہ میں پہاڑ بن کر کھڑا ہو گیا تھا، اور جس طرح ایک زمانے میں جاگیرداری ترقی کی طرف چند قدم لے جانے کے بعد سماج کو مزید ترقی کی طرف لے جانے کی صلاحیتیں کھو چکی تھی اسی طرح آج سرمایہ داری نظام اور وسائل ثروت کا چند ہاتھوں میں سمٹاؤ ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ چند "ظاہری" اور "باطنی" اخلاقی یا مذہبی پابندیاں

اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتیں۔ آج لاکھوں اور کروڑوں روپیہ نفع کے سودے غنڈوں میں ہوتے ہیں۔ آج دس پندرہ ہزار مزدوروں پر حکومت کرنے اور ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہڑپ کرنے والا کارخانہ دار کروڑوں روپے سالانہ نفع کماتا ہے چنانچہ کروڑوں روپے سالانہ نفع کمانے والے اصفہانیوں، ہارونوں، جیبوں اور مراتب علیوں نیز زمین کی پیداوار میں کوئی روپیہ نہ لگانے اور کوئی محنت نہ کرنے کے باوجود نیم مزارعوں سے مالکانہ یا لگان کے علاوہ جو کل پیداوار کا عموماً نصف ہوتا ہے کئی قسم کے جاگیرشاہی ٹیکس مثلاً خرچہ، راج دربار، کرایہ، نذرانہ، کمیانہ، منشیانہ، شادی ٹیکس، مویشی ٹیکس، دروازہ ٹیکس، الیکشن ٹیکس، حج ٹیکس، موٹر ٹیکس، بیماری ٹیکس وغیرہ وصول کرنے اور اس طرح کل پیداوار کے تین چوتھائی حصہ کے مالک بن جانے والے دولتانوں، خاکوانیوں کھوڑوں، ٹوانوں، ٹوانوں، تالپوریوں، کالاباغوں، گردیزیوں، لغاریوں وغیرہ کا اڑھائی فی صدی سالانہ زکواۃ دینے، چند ہزار روپے سالانہ خیرات کرنے نیز حج کے لئے مکہ جانے اور جائداد کی ورثہ میں تقسیم کرنے سے کچھ نہیں بگڑتا۔ نہ دولت ان کے ہاتھوں میں سمٹنے سے رکتی ہے، نہ وسائل پیداوار ان کے قبضہ میں جانے سے رکتے ہیں، نہ مالک کاشتکار اپنی زمینوں، دستکار اپنے اوزاروں اور چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں، اور غریب اور درمیانہ تاجر اپنی تجارتی دکانوں سے محروم ہو کر اپنی طاقت محنت فروخت کر کے پیٹ پالنے والے مزدوروں کی صف میں شامل ہونے سے بچتے ہیں، نہ زکوۃ اور خیرات لینے سے عوام کی حالت سدھرتی ہے اور نہ موجودہ دنیا جو دوزخ کا نمونہ ہے جنت میں تبدیل ہوتی ہے

درحقیقت سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان تیسری کوئی "متوسط راہ" نہیں ہے۔ مولانا مودودی اسلام کے اقتصادی نظام کے نام سے جو راہ پیش کرتے ہیں، وہ کوئی تیسری راہ نہیں۔ وہی راہ ہے جس پر سرمایہ دار اور جاگیردار گامزن ہیں۔ مولانا مودودی

دراصل بڑے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کسانوں اور مزارعوں کو زمین کا مالک بنانا نہیں چاہتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی املاک قومی ملکیت بنائی جائیں، اور مزدوروں کی حالت بنیادی طور سے بہتر ہو۔ لیکن چونکہ آج مزدور اور کسان بیدار ہو چکے ہیں اور اپنے جائز حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، اس لئے مولانا کو صاف طور سے یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی عوام دشمنی پر "اسلامی نظام" کا پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن پاکستان کے عوام یہ سمجھ لیں گے کہ یہ پردہ خدا اور رسول کا ڈالا ہوا نہیں، اسے اسلام کی تاریخ سے قطعی کوئی تعلق نہیں۔ یہ دراصل بڑے سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں اور ان کے حمایتی مولانا مودودی کے ہاتھوں کا ہی بنا ہوا ایک جال ہے جس میں کوئی سمجھدار اور ایماندار آدمی نہیں پھنسے گا۔

جماعت اسلامی کے سیاسی مقاصد

جماعت اسلامی خلافت راشدہ تک کے دور کو صرف اسلامی حکومت کا دور تصور کرتی ہے اور اس کے بعد تمام مسلمان شاہی خاندانوں کو غیر اسلامی حکومتیں قرار دیتی ہے وہ مغربی جمہوریت، سوویٹ جمہوریت اور عوامی جمہوریت تینوں کو مسترد کرتی ہے۔ اور اعلان کرتی ہے کہ اس کی جدوجہد کا مقصد وہی نظام قائم کرنا ہے جو رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد میں مدینہ میں تھا۔

اگر تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو حقیقت صاف نظر آتی ہے کہ خلافت راشدہ کے دور کا نظام عربوں کے سماجی ارتقا کے ایک مخصوص دور کا پرتو تھا۔

جزیرۃ العرب میں ساحل کے قریب جہاں بارش کبھی کبھار ہوتی رہتی ہے زرعی بستیاں اور شہر ہیں۔ باقی تمام ملک صحرا ہے جہاں بدو قبیلے چشموں کے قریب چراگاہوں میں کھجور کے

درختوں کے نیچے اُون کے بنے ہوئے کپڑے کے خیموں میں رہتے تھے۔ مدینہ چھوٹے چھوٹے مالک کاشتکاروں، دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کی بستی تھا اور مکہ جو زمزم کے چشمہ اور کعبہ کی وجہ سے مشہور تھا۔ قریش تاجروں کا شہر تھا جو کعبہ کے پاسبان بھی کہلاتے تھے صحرائے عرب میں پدر سری قبیلی نظام تھا جس کے اعتبار سے قبیلہ میں سب سے بڑا رکن سردار تھا اور شیخ کہلاتا تھا۔ اس کا ہر حکم ماننا قبیلہ کے ہر رکن کا مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی فرض تھا مگر اس کی حیثیت مطلق العنان بادشاہ ایسی نہ تھی۔ وہ قبیلہ کی قدیم روایات، رسم و رواج اور قبیلہ کے ہر خاندان کے بزرگ ترین رکن پر مشتمل مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا پابند تھا۔ شہروں اور بستیوں میں قدیم قسم کی جمہوریت تھی، مدینہ میں مالک کاشتکاروں، دستکاروں اور چھوٹے تاجروں کی اور مکہ میں امیر تاجروں اور غلاموں کے آقاؤں کی۔

عہد رسالت میں اقتصادی، سیاسی اور سماجی مسائل حل کرنے کا سوال پانچ چھ ہزار کسانوں، دستکاروں، اور چھوٹے تاجروں کی بستی مدینہ تک محدود رہا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلعم مسلمانوں کی چھوٹی سی جمعیت کے سردار، مذہبی رہنما، قاضی القضات اور امیر عسکرِ مجاہدین تھے۔ اور مہاجر و انصار صحابہ کرام مجلس شوریٰ کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔

فتح مکہ کے بعد حدود کی توسیع، اُموی امرا اور جزیرۃ العرب کے تقریباً تمام قبیلوں کی مسلمانوں کی صفوں میں شمولیت اور فتوحات کے نتیجہ کے طور پر مال غنیمت کی آمد غرضیکہ فتوحات اور دولت کی آمد نے حالات بدل دیئے۔ آنحضرتؐ کے فوت ہوتے ہی خلافت کے کئی مُدعی کھڑے ہو گئے۔ مگر حضرت عمر فاروقؓ نے اہل مدینہ، صحابہ کرام اور مدینہ میں موجود قبائلی سرداروں کو جمع کر کے حضرت ابوبکرؓ کا نام پیش کیا اور سب سے پہلے خود ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس مشکل مسئلہ کو حل کیا۔ یہ تجویز پدر سری قبیلی روایات کے مطابق تھی۔ صحابہ کرام میں عمر کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ سب سے بڑے تھے۔ علاوہ اس کے وہ سب سے زیادہ نیک اور حلیم الطبع نیز مہاجر، آنحضرتؐ کے خسر اور پہلے تین ایمان لانے والوں میں تھے، چنانچہ

سب نے بیعت کر کے انھیں خلیفۃ الرسول اللہ تسلیم کر لیا۔ ۶۳۴ء میں دوسرے خلیفہ کا انتخاب اس طریقہ سے بھی نہیں ہوا۔ خلیفہ اوّل نے فوت ہونے سے پہلے حضرت عمرؓ فاروق کو نامزد کر دیا اور صحابہ کرام نے مسجد نبوی میں جمع ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حضرت عمرؓ نے رحلت فرمانے سے پہلے چھ صحابہ کرام پر مشتمل ایک کمیٹی تیسرے خلیفہ کا فیصلہ کرنے کے لئے مقرر کر دی۔ اس کمیٹی میں عبدالرحمٰن بن عوف بھی تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف کو پانچوں امیدواروں نے خلیفہ منتخب کرنے کا اختیار دیدیا۔ انھوں نے عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا اور سب صحابہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے انھیں خلیفۃ الرسول اللہ تسلیم کر لیا۔ صحابہ کرام اور مدینہ میں موجود قبائلی سردار عہد رسالت سے لے کر بدستور مجلس شوریٰ کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مگر خلافت راشدہ کے زمانہ کا نیم قبائلی اور نیم قدیم شہری ریاستی نظام ایک عبوری دور کا نظام تھا۔ عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایران کے زرخیز خطوں کو فتح کرنے کے بعد عرب وہ پرانے عرب نہ رہے جو عرب کے ریگستانوں میں، چشموں یا کنوؤں کے قریب چراگاہوں میں کھجور کے درختوں تلے اُون کے بنے ہوئے کپڑے کے خیموں میں رہتے۔ رات کے وقت اونٹ چراتے اور سفر کرتے اور اونٹنی کا دودھ پیتے اور کھجوریں کھاتے تھے۔ فتوحات، نیز دولت، غلاموں اور کنیزوں نے ان کے روزی کمانے کے وسیلے بدل دیئے۔ اقتصادی اور سماجی حالات بدل دیئے۔ خیالات اور نظریئے بدل دیئے۔ ارادے اور مقاصد بدل دیئے۔ پہلے دو خلفاء راشدین نے عربوں کو مفتوحہ علاقوں میں زمینوں پر قبضہ کر کے آباد ہونے کی مخالفت کی تھی۔ مگر عراق، شام، فلسطین، لبنان، مصر اور ایران کے زرخیز خطوں کو فتح کرنے اور دولت غلام اور کنیزیں ملنے سے رہنے سہنے کے طریقے بدل گئے۔ زمینوں پر قبضہ کر کے آباد ہونے اور خیموں کے بجائے عالیشان محلوں میں رہنے کی طرف رجحان بڑھ گیا۔ حضرت عمرؓ نے عربوں کو اس طرف بڑھنے سے روکے رکھا۔ مگر تیسرے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے عرب سرداروں بالخصوص اپنے رشتہ دار اموی امراء کے مجبور کرنے سے عربوں کو مفتوحہ علاقوں میں زمینوں پر قبضہ کرنے کی اجازت دیدی

چنانچہ قبائلی سرداروں، سرکردہ مجاہدوں، فوجی کمانڈروں، گورنروں، جاگیرداروں، غلاموں کے آقاؤں اور تاجروں کا ایک طبقہ ابھر آیا جس نے دولت اور اقتدار کے لئے جنگ کو جو پیغمبر اسلام کے فوت ہوتے ہی شروع ہوگئی تھی مزید تیز کر دیا اور مدینہ کی نیم قبائلی اور نیم قدیم شہری ریاست وقت کے تقاضوں کے مطابق نہ رہی۔ جس طرح فوجی کمانڈروں نے دوسرے ملکوں کو فتح کر کے روم قدیم کی شہری ریاست کو مطلق العنان بادشاہت میں بدل دیا تھا۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ کے عہد میں فوجی کمانڈر اور گورنر بن کر اموی اُمرا نے مدینہ کی نیم قبائلی اور نیم شہری ریاست کو ختم کر کے عرب قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور امیر تاجروں کے مفاد کی نمائندہ اور محافظ مطلق العنان بادشاہت قائم کر دی اور عربوں کی قدیم قبائلی سماج اور خلافت راشدہ کے زمانہ کی نیم قبائلی اور نیم شہری ریاست سے ایک ایسی سماج کا نشو و نما ہوا جس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق زوال پذیر قبائلی نظام، روبہ تنزل غلام شاہی اور ابھرتی ہوئی جاگیر شاہی تینوں کی خصوصیات موجود تھیں۔ تاریخی دور کا تقاضا یہی تھا۔ اگر بنو امیہ کے بجائے حضرت علی یا حضرت زبیر کے فرزند کامیاب ہوتے نظام تب بھی یہی قائم ہوتا تھا۔ بنو امیہ کے کامیاب ہونے کی پہلی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے حضرت عثمان کے عہد میں تمام کلیدی عہدوں پر قبضہ کر کے قبائلی سرداروں، فوجی کمانڈروں اور سرکردہ مجاہدوں کو دولت جمع کرنے اور جاگیردار بننے میں مدد دی تھی۔ چنانچہ بااثر قبائلی سرداروں فوجی کمانڈروں اور سرکردہ مجاہدوں کا وہ گروہ جو امیر اور جاگیردار بن چکا تھا اپنے حقوق و مراعات کی حفاظت کے لئے امویوں کا حامی اور مددگار تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ قریش کے مختلف خاندانوں میں خلافت کے لئے تگ و دو ہو رہی تھی اور عرب اس طرف متوجہ ہونے کے بجائے صحرائے عرب سے نکل کر عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایران کے زرخیز خطوں میں آباد ہو رہے تھے اور اموی امرا انہیں آباد ہونے میں مدد دے رہے تھے۔

بہرکیف رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد کے مدینہ میں نیم قبائلی اور نیم شہری ریاستی

نظام، عربوں کے ایک مخصوص اقتصادی، سیاسی اور سماجی ارتقاء کا پرتو تھا۔ حالات تبدیل ہوتے ہی ایک نئے نظام کا نشو و نما ہوا جس میں زوال پذیر قبائلی نظام، روبہ تنزل غلامی شاہی اور ابھرتی ہوئی جاگیر شاہی، تینوں کی خصوصیات موجود تھیں اور عرب قبائلی سرداروں، جاگیرداروں اور غلاموں کی خرید و فروخت کرنے والے عرب تاجروں کے مفاد کی نمائندہ اور محافظ بنو امیہ کی مطلق العنان بادشاہت نے انہی عراقی، شامی، مصری اور ایرانی کاشتکاروں کو جنھیں پہلے دو خلفاء راشدین کے عہد میں ساسانی اور رومی جاگیرداروں کی غلامی سے آزاد کیا گیا تھا، عرب جاگیرداروں کا عملی طور پر زرعی غلام بنا دیا اور غیر عرب مسلمانوں سے وہ حقوق (مثلاً وظیفہ لینے، جزیہ نہ دینے وغیرہ کے حقوق) چھین لیے جو انھیں ابتدائی دور میں ملے تھے۔ بنو امیہ کی اس متشددانہ پالیسی کے خلاف ایرانی اور عراقی کاشتکاروں کی بغاوتوں۔ غیر عرب مسلمانوں کی اموی حکمرانوں سے نفرت اور

عرب اُمراکی دو مضبوط پارٹیوں، بنو کلب[1] اور بنو قیس[2] میں رقابت و مخاصمت کے سبب سلطنت بنو امیہ کے ہر حصہ میں خانہ جنگی، نیز فتوحات رُک جانے سے تجارتی اور مالی بحران اور اس بحران کے سبب سے عوام میں بے چینی و اضطراب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بنو عباس نے ایرانی کاشتکاروں کی مدد سے خراسان میں بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ تین سال کے قلیل عرصہ میں سلطنت بنو امیہ ریت کی دیوار کی طرح گر کر نابود ہو گئی اور ہسپانیہ کے علاوہ باقی سب ممالک میں جہاں بنو اُمیہ کا سفید جھنڈا لہراتا تھا، ۷۵۰ء میں بنو عباس کا سیاہ جھنڈا لہرانے لگا۔

بنو امیہ کی طرح بنو عباس بھی مستبد مطلق العنان بادشاہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ

---

[1] یمنی امرا کی پارٹی　[2] حجازی اُمرا کی پارٹی

بنو امیہ کی حکومت صرف عرب اُمرا کی حکومت تھی۔ اور بنو عباس نے چونکہ ایرانیوں اور عراقیوں
کی سرگرم حمایت اور امداد سے طاقت حاصل کی تھی، اس لئے ان کے عہد میں حکمران طبقہ
عرب اُمرا اور غیر عرب مسلمان اُمرا دونوں پر مشتمل تھا۔

بنو امیہ کے عہد میں حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ مالِ غنیمت تھا۔ چنانچہ فتوحات
رُک جانے کے سبب جب مالِ غنیمت کی آمد بند ہوگئی تو تجارتی اور مالی بحران پیدا ہوگیا
اور بنو امیہ کے نظامِ حکومت پر زوال کے بادل چھا گئے۔ بنو عباس نے حکومت کی آمدنی
بڑھانے اور حکومت کی بنیادوں کو زیادہ مستحکم کرنے کے لئے زراعت، صنعت اور تجارت
کو فروغ دیا۔ تجارت کو فروغ دینے کے لئے انھوں نے دستکاری کی حوصلہ افزائی
کی، سڑکوں کا جال بچھایا، تاجروں کے قافلوں کی حفاظت کا بندوبست کیا اور کاروان
سرائیں تعمیر کیں، اور زراعت کو ترقی دینے کے لئے انھوں نے نہریں جاری کیں اور تالاب
کھدوائے۔ تجارت سے حکومت کی آمدنی بڑھانے کے لئے محاصل کا ہمہ گیر نظام قائم
کیا اور زراعت سے حکومت کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ کرنے کے لئے انھوں نے ایسے
جاگیرداری نظام کی حوصلہ افزائی کی جس کے ماتحت جاگیردار کاشتکاروں سے بٹائی کی
صورت میں لگان وصول کر کے اس کا ایک مقررہ حصّہ بطور مالیہ یا خراج حکومت
کو دیتے تھے۔

عباسیوں نے بنو امیہ کی حکومت کو لادینی اور غیر اسلامی کہہ کر مذمت کرتے ہوئے
پروپگنڈا کیا تھا کہ ان کا مقصد خلافتِ راشدہ ایسی حکومت قائم کرنا ہے، چنانچہ ایرانی اور عراقی
کاشتکاروں نے صرف اس اُمید پر عباسیوں کی حمایت کی کہ جس طرح پہلے دو خلفاءِ راشدین
کے عہد میں ساسانی اور رومی جاگیرداروں کی غلامی سے آزادی ملی تھی، اُسی طرح عباسیوں
کے برسرِ اقتدار آنے سے اموی امراء کے جاگیری نظام سے نجات مل جائے گی۔ برعکس اس کے
عباسیوں نے جب کاشتکاروں اور دستکاروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو پہلے سے زیادہ

غصب کرنے کی بنیادوں پر جاگیرداری اور حکومت کے مالی نظام کو مستحکم کیا، تو حالت کاشتکاروں اور دستکاروں کی پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی چنانچہ دوسرے عباسی خلیفہ منصور (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) کے عہد سے ایران، وسط ایشیا، عراق اور شام میں غیر ملکی حکمرانوں اور جاگیرداروں، نیز ان کے حامی اور مددگار مقامی جاگیرداروں کے خلاف کاشتکاروں، دستکاروں، اور غلاموں کی طبقاتی بغاوتوں کا دور شروع ہوا جو مسلسل پونے دو سال رہا[1]:۔

---

[1] ۷۵۵ء میں سن باد اور ۷۶۶ء میں استاد سیس کی رہنمائی میں خراسان کے کاشتکاروں کی بغاوت ۷۷۶ء سے ۷۸۳ء تک ہاشم بن حاکم المعروف مقنع کی سرکردگی میں خراسان اور تاجکستان کے کاشتکاروں، زرعی غلاموں اور دستکاروں کی بغاوت جو "سفید پوش کسانوں" کی بغاوت کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس بغاوت کے چند سال بعد بحیرہ خزر کے مشرق میں جرجان کے کاشتکاروں نے بغاوت کی جو سرخ لباس پہننے کے سبب "سرخ پوشوں" کی بغاوت بھی کہلاتی ہے۔ ۹ویں صدی کے شروع میں ایک بیس سالہ نوجوان بابک خورمی کی سرکردگی میں آذربائیجان کے کاشتکاروں اور زرعی غلاموں نے بغاوت کی جسے تیس سال تک عباسی فوجیں دبانے میں ناکام رہیں۔ ۸۶۹ء میں بصرہ کے قریب شورے کی کانوں میں کام کرنے والے حبشی غلاموں نے ایک ایرانی علی بن محمد کی رہنمائی میں بغاوت کی۔ یہ بغاوت جو آگ کی طرح عراق، کالدیا اور شمالی شام کے بڑے بڑے کھیتوں، کانوں اور دستکاریوں میں کام کرنے والے غلاموں میں پھیل گئی اور ۸۸۳ء تک رہی۔ ۸۹۰ء سے ۹۳۰ء تک عراق، کالدیا اور بحرین کے غلاموں، زرعی غلاموں، کاشتکاروں اور دستکاروں نے بغاوت کی یہ جو تحریک کے بانی ایک عراقی کسان ہمدان قرامطہ کے نام سے قرامطہ کی بغاوت مشہور ہے۔ یہ اور ابو سعید الجنابی کی سرکردگی میں ہوئی تھی:۔

اِن بغاوتوں نے جنھیں حکمرانوں کی فوجی کارروائیوں نے سختی سے دبا دیا، پہلی بات یہ کی کہ عباسیوں کے مضبوط مرکزی نظامِ حکومت کو اپاہج اور کمزور کر دیا۔ ۹ ویں عباسی خلیفہ واثق باللہ (۸۴۲ء تا ۸۴۷ء) کے بعد خلافت عباسیہ پر زوال کے بادل چھا گئے۔ دوسری یہ کہ سرکاری کانوں اور روئی کے کارخانوں نیز بڑے بڑے کھیتوں میں کام کرنے والے غلام آزاد ہو گئے۔ تیسری یہ کہ عرب جاگیردار اور ان کے حامی و مددگار مقامی جاگیردار، دونوں بہت کمزور ہو گئے۔ اور چوتھی بات یہ کہ ان بغاوتوں نے جو غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تھیں قومی جذبوں کو بیدار کر کے مقامی صنعت اور تجارت کو ترقی دینے میں مدد دی، چنانچہ تجارتی راستوں پر آباد صنعتی اور تجارتی شہروں کے تاجروں نے ترقی کر کے عرب تاجروں کی اجارہ داری پر کاری ضرب لگائی اور جس طرح ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کے

تاجر ترقی کر کے قومی بادشاہتوں کے سنگِ بنیاد بنے تھے۔ اُسی طرح عباسیوں کے ماتحت ممالک میں تاجروں نے صوبائی گورنروں[1]، سابق غلام افسروں[2] اور گورنروں، باغی فوجی سپاہیوں[3] پسماندہ قبیلوں کے سرداروں[4] کو اپنی آزاد اور خود مختار بادشاہتیں اور دوسرے ملکوں کو فتح کر کے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنے میں سنگِ بنیاد کا کام کیا اور خلفاء بنو عباس اس قدر کمزور ہو گئے کہ ان کا عملی طور پر کام صرف یہ رہ گیا کہ اپنی طاقت سے حکومت قائم کرنے والوں کی فرمانروائی کو تسلیم کر کے انھیں امیر الامرا، سلطان یا شاہ شرق و غرب کے خطابات دے دیا کریں۔ اسی پر اکتفا نہیں، اُمویوں نے ہسپانیہ میں اور فاطمیوں نے شمالی افریقہ اور مصر میں اپنی حکومت قائم کر کے خلیفۃ المسلمین ہونے کے اعلان کر دیئے۔ غرضیکہ دسویں اور گیارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ایک کے

---

[1] شمالی افریقہ میں بنو اغلب، خراسان میں طاہری اور وسط ایشیا میں سامانی عباسیوں کے گورنر تھے جب عباسی خلافت کمزور ہو گئی تو گورنر خود بادشاہ بن گئے۔

بجائے تین خلیفۃ المسلمین اور سینکڑوں کی تعداد میں چھوٹی بڑی ریاستیں، بادشاہتیں اور سلطنتیں تھیں۔

یورپ میں بادشاہ ملک کے فرمانروا اور زمینوں کے مالک تھے چنانچہ اپنے رشتہ داروں وفاداروں اور معتمد افسروں کو جاگیریں عطا کرتے ہوئے انہوں نے وہی حقوق دیئے جو نظری اور عملی طور پر انھیں خود حاصل تھے۔ غرضیکہ وہ اپنی جاگیروں میں فرمانروا بھی تھے اور زمینوں کے مالک بھی۔ زمینوں کے تیسرے مالک حقیقی کاشتکار تھے۔ اِن تینوں مالکوں کے درمیان حقوق و اختیارات کی تخصیص اور تقسیم کے لئے بارھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک جدوجہد ہوئی۔ جاگیرداروں نے بادشاہ کے حقوق ملکیت کو چیلنج کیا اور کاشتکاروں نے جاگیرداروں کے حقوق ملکیت کے خلاف بغاوتیں کیں۔ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ صرف فرمانروا رہ گئے، جاگیردار زمینوں کے مالک بن گئے، اور

۲ـ نویں عباسی خلیفہ واثق باللہ کے بعد ایک سو سال تک حقیقی حکمراں وسط ایشیا کے ترک غلاموں (مملوک) کی فوج کے افسر تھے جو امیر الامرا کہلاتے تھے۔ سلطنت غزنویہ کے بانی الپتگین اور سبکتگین سامانیوں کے غلام تھے جو ترقی کر کے فوجی افسر اور گورنر بنے اور پھر آزاد بادشاہ مصر کا احمد بن طولون بھی ترک غلام تھا جو مصر کا گورنر اور پھر آزاد بادشاہ ہوا۔

۳ـ صفاریہ خاندان کا بانی یعقوب بن لیس جسے ۸۶۷ء میں طاہریوں سے سیستان، خراسان اور طبرستان چھین کر اپنی حکومت قائم کی، طاہریوں کی فوج میں سپاہی تھا۔

۴ـ شیعہ بویہ خاندان کے امیر الامرا جو ۹۴۶ء سے ۱۰۵۵ء تک عباسی خلفا کو تخت پر بٹھاتے اور اُسے اتارتے رہے، شمالی ایران کے پہاڑی قبیلوں کے سردار تھے۔ سلجوق وہ ترکمان ہیں جو دسویں صدی کے وسط میں کرغزیہ کے کاہستان سے آئے اور غزنویوں کے عہد میں خراسان میں آباد ہوئے اور اسلام قبول کیا۔

کاشتکاروں کو مزارعہ بنا دیا گیا۔

ایشیائی ممالک بالخصوص مسلمانوں کے زیر اثر ممالک میں جہاں کاشت کرنے کے لئے زمین وسیع تھی، نظری اعتبار سے فرمانروا اور زمینوں کا مالک خدا تھا۔ بادشاہ اس کے حرف خلیفہ تھے چنانچہ جاگیریں عطا کرتے ہوئے انہوں نے جاگیرداروں کو زمینوں کا مالک نہیں بنایا۔ انہوں نے وہی حقوق دیئے جو انھیں خود حاصل تھے۔ یعنی مالیہ اکٹھا کرنے اور ملک کا انتظام کرنے کے حقوق۔ چنانچہ جاگیردار کاشتکاروں سے مالیہ اکٹھا کر کے اسمیں سے ایک مقررہ حصہ بادشاہ کو بھیجدیتے تھے اور باقی حصہ اپنی امیرانہ شان کو برقرار رکھنے اور ملک کے نظم ونسق نیز تعمیرات عامہ پر خرچ کرتے تھے۔ کاشتکاروں کو زمین کی کاشت کرنے کا حق حاصل تھا، جاگیردار اور بادشاہ کو سروکار صرف مالیہ وصول کرنے سے تھا، جو گاؤں کی پنچایتیں کاشتکاروں سے اکٹھا کر کے جاگیردار یا حکومت کو ادا کرتی تھیں۔

چنانچہ ایشیائی ممالک میں بادشاہوں جاگیرداروں کاشتکاروں کے درمیان حقوق و اختیارات کی تقسیم و تخصیص کے لئے کبھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ بنوامیہ، بنوعباس اور ان کے بعد دوسرے شاہی خاندانوں کے عہد میں کسانوں کی جتنی بغاوتیں ہوئیں وہ مالیہ وصول کرنے کے حق کے خلاف نہیں تھیں، یہ بغاوتیں لگان یا مالیہ میں اضافہ کے خلاف تھیں۔ اسی طرح جاگیرداروں نے بادشاہوں کے حقوق و اختیارات کو کم کرنے کے لئے کبھی کوئی جدوجہد نہیں کی۔ جاگیردار اُبھر کر پرانے شاہی خاندان کو گراتے اور اپنے خاندان کو شاہی خاندان میں منتقل کرتے رہے، مگر کسی جاگیردار نے بادشاہ کے حقوق و اختیارات کو نظری اعتبار سے چیلنج کر کے جدوجہد نہیں کی۔

قرون وسطیٰ کے یورپ میں اقتصادی اور سیاسی اکائی (یونٹ) جاگیری ریاست تھی ان جاگیری ریاستوں میں نئے صنعتی اور تجارتی شہروں نے اُبھر کر اقتصادی اعتبار سے دیہات کو اپنا دست نگر اور محتاج بنایا اور تاجروں اور صنعتی ورکشاپوں کے مالکوں نے

ریڈ گلڈوں اور پنچایتوں (کمیونوں) میں منظم ہو کر اقتصادی اور سیاسی حقوق حاصل رنے کے لئے جدوجہد شروع کی۔ پہلے انہوں نے ازمنہ وسطےٰ کی بلدیات کو ایک ہتھیار بند ور خود مختار جماعت بنایا" اُس کے بعد ہر جاگیری ریاست کے الگ محصولاتی نظام کو ختم کرنے کے لئے بڑی بڑی بادشاہتوں کے قیام میں مدد دے کر اپنے آپ کو اقتصادی اور سیاسی طور پر مضبوط کیا، اور پھر جب کم سے کم قیمت پر کچا مال خریدنے اور کم سے کم اُجرت پر کام رنے والے اُجرتی مزدور حاصل کرنے اور تیار شدہ اشیاء کو دیہات میں فروخت کرنے کے راستے میں جاگیرداری نظام حائل ہوا، تو انہوں نے جاگیرداری بادشاہت کی اقتصادی سیاسی اور فوجی طاقت کو کمزور یا ختم کر کے طاقت و اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے کی جدوجہد شروع کی۔ جاگیرداری مطلق العنان بادشاہت کے پرستار تصورات، خیالات مذہبی عقائد اور اخلاقی نظریے شاہ کو ظل اللہ قرار دیتے تھے۔ جدید سرمایہ داری کے حامی فلسفیوں مثلاً فرانس کے والٹیر، روسو وغیرہ نے آزادی مساوات، اخوت، عوام کی حاکمیت اور جمہوریت کے اقتصادی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی تصورات پیش کئے۔ سرمایہ داروں نے اقتصادی جماعتوں کے ساتھ ہی ساتھ اپنی سیاسی پارٹیاں قائم کیں اور ان سیاسی پارٹیوں کی رہنمائی میں جمہوری انقلابات نے جاگیرداروں اور بادشاہوں سے طاقت و اختیارات چھین کر مزارعوں اور کاشتکاروں کو جاگیری نظام سے آزادی دلائی اور پرانے جاگیرداری نظام کے کھنڈرات پر نئے اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام، سرمایہ داری نظام کی عمارت تعمیر ہوئی۔

ایشیا میں شہروں کی صنعت چونکہ بادشاہوں، گورنروں، درباریوں اور اونچے سرکاری افسروں کے عیش و آرام کی قیمتی چیزیں اور فوج کے لئے سامان جنگ تیار کرتی تھی، اس لئے وہ دیہات کے مضبوط و مستحکم خود کفیل زرعی اور صنعتی نظام کو درہم برہم کر کے دیہاتی اقتصادیات کو شہروں کی صنعت و تجارت کے تابع اور دست نگر

بنانے میں ناکام رہی، شہروں کے دستکار اور تاجر جنہوں نے دیہاتی عوام کو ارزاں قیمت پر اشیاء فروخت کرنے کے لئے سائنس کے نئے نئے انکشافات کی بنیادوں پر پیداوار کے اوزار اور طریقے بدلنے تھے۔ بنیادی طور پر کمزور رہے اور اس کمزوری کے سبب نہ چھوٹی چھوٹی ورکشاپیں بڑے بڑے کارخانوں میں تبدیل ہوئیں، اور نہ تاجروں اور دستکاروں میں سے معدودے چند ابھر کر کارخانہ دار اور بنکوں کے مالک اور ڈائرکٹر بنے۔ صنعتی و تجارتی شہروں میں دستکاروں اور تاجروں نے اپنے اپنے ٹریڈ گلڈوں میں منظم کیا اور طوائف الملوکی کے دور میں کئی شہروں مثلاً ہسپانیہ میں قرطبہ[1] اور سیوائل میں جمہوریتیں بھی قائم کیں۔ مگر دستکاروں اور تاجروں کی بنیادی اقتصادی اور سیاسی کمزوری کے باعث یہ جمہوریتیں زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکیں۔ جب کبھی حملہ ہوا، شہری دستکاروں اور تاجروں نے اپنے ٹریڈ گلڈوں کے ماتحت ہتھیار بند ہو کر دشمنوں[2] کا مقابلہ بھی کیا۔

---

[1] گیارھویں صدی کے شروع میں ہسپانیہ میں بنو امیہ کا سورج غروب ہو جانے سے جب سارے ملک میں طوائف الملکی پھیل گئی، تو قرطبہ کے تاجروں اور دستکاروں نے جو بہت مضبوط تھے جمہوریت قائم کی۔ اس جمہوریت کو جو چالیس برس قائم رہی ۱۰۷۵ء میں سیوائل (اشبیلیہ) کے بادشاہ معتمد باللہ نے جو بنو عباد میں سے تھا قرطبہ پر قبضہ کر کے اس جمہوریت کو ختم کر دیا۔ جمہوریت ۹۳۶ء میں سوائل کے تاجروں اور دستکاروں نے بھی قائم کی جو صرف دو برس رہی قشتالہ کی عیسائی فوجوں نے ۱۲۴۸ء میں حملہ کیا اور پندرہ مہینے بہادری سے ان کے خلاف لڑنے کے بعد یہ جمہوریت ختم ہو گئی۔

[2] تیرھویں صدی کے شروع میں چنگیز خاں کی منگول اور تاتاری فوجوں نے حملہ کیا، تو وسط ایشیا کے ترک سلطان خوارزم شاہ کے گورنروں، سپہ سالاروں اور با اثر جاگیرداروں نے اپنی جاگیریں اور حقوق بچانے کے لئے عوام سے غداری کی اور اطاعت قبول کر لی، مگر وسط ایشیا کے مشہور صنعتی، تجارتی

مگر بنیادی طور پر کمزور ہونے کے سبب دشمنوں پر فتح حاصل نہ کرسکے۔

ایشیائی ممالک میں نئی پیداواری طاقتوں کی بنیادی کمزوری کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑا۔ قرونِ وسطیٰ کے جاگیرشاہی نظام میں علم و ادب، اور سائنس و فلسفہ کی جس قدر ترقی ہو سکتی تھی، وہ تیرھویں اور چودھویں صدی تک

اور تہذیبی شہروں مثلاً سمرقند، بخارا، خوارزم، مرو، ہرات، اور بلخ کے دستکاروں اور تاجروں نے جو ٹریڈ گلڈوں میں منظم تھے بڑی بہادری سے چنگیزی فوجوں کا مقابلہ کیا اور فتح کے بعد انتقام لینے کے لئے چنگیز خاں نے ہر شہر میں لاکھوں کی تعداد میں تاجروں اور دستکاروں کا قتل عام کرتے ہوئے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا۔ ان سب باتوں کے باوجود ان شہروں کے تاجر اور دستکار منگولوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بار بار اٹھے۔ سب سے زیادہ مشہور بخارا کے تاجروں کاشتکاروں اور دستکاروں کی بغاوت ہے جو انہوں نے منگولوں اور مقامی جاگیرداروں کے خلاف ۱۲۳۸ء میں بخارا کے قریب ایک گاؤں تراب کے ایک دستکار محمود ترابی کی سرکردگی میں کی۔

۱۳۶۵ء میں منگولستان کے منگولوں نے سمرقند پر حملہ کیا۔ والیِ شہر حسین اور اس کا سپہ سالار تیمور لنگ دونوں شہر کو حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے مگر ابوبکر کیلوی نامی ایک پارچہ باف کی سرکردگی میں شہر کے دستکار اور تاجر اس بہادری سے لڑے کہ منگول شکست کھا کر بھاگ گئے۔

ابوبکر کی سرکردگی میں دستکاروں اور تاجروں نے جمہوریت قائم کی۔ حسین اور تیمور دونوں واپس آگئے اور انہوں نے دھوکے سے ابوبکر کو اپنے فوجی کیمپ میں مدعو کر کے قتل کر دیا۔ جمہوریت ختم ہو گئی۔ شہر پر انہوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کے پانچ سال بعد تیمور نے حسین کے خلاف بغاوت کر کے سمرقند اور بخارا پر اپنی حکومت قائم کر لی اور وسط ایشیا کو فتح کرنے کے بعد دوسرے ملکوں پر حملے کئے۔ اُسنے ہر شہر میں قتل عام کیا، اور ہر شہر کو تاراج و برباد کر کے دستکاروں کو غلام بنا کر سمرقند لایا اور اُسے سب سے بڑا صنعتی مرکز بنایا۔

اپنے عروج پر پہنچ کر رُک گئی نہ نئے ادیب، سائنسداں اور شاہ کے ظل اللہ ہونے کے نظریہ کے مقابلے میں عوام کی حاکمیت کا نظریہ پیش کرنے والے فلسفی پیدا ہوئے، نہ جاگیرداری اور مطلق العنانی کے خلاف سرمایہ داروں نے سیاسی جماعتوں میں منظم ہو کر انقلابی تحریکوں کی رہنمائی کی، اور نہ یورپ کی طرح ایشیا میں جاگیرداری نظام کے بطن سے سرمایہ داری نظام نے جنم لیا۔ چنانچہ ایشائی ممالک میں ایک کے بعد دوسرا شاہی خاندان اُبھرتا اور چار دن کی عظمت کے بعد کسی دوسرے شاہی خاندان کے اُبھرنے سے صفحۂ ہستی سے مٹتا رہا۔ شہر آباد ہوتے اور چند دن کی عظمت کے بعد تاراج اور برباد ہوتے رہے۔ دیہات کا خود کفیل پنچایتی نظام جوں کا توں رہا، اور مزید گلڈ ترقی نہ کرسکنے کے سبب بے اثر یا بن گئے۔ تاجروں میں سے فرداً فرداً کسی نے ترقی کی اور بادشاہوں، نوابوں، راجوں اور جاگیرداروں کی ریاستوں یا جاگیروں کے ناظم یا دیوان بنے، مگر بحیثیت طبقہ تاجر پیشہ لوگ حکمران بننے کی صلاحیت پیدا نہ کرسکے۔

جس طرح شاہی خاندان اُبھرتے اور صفحۂ ہستی سے مٹتے رہے، جس طرح شہر آباد ہو کر تاراج اور برباد ہوتے رہے، اُسی طرح مذہبی عقائد، سیاسی اور سماجی نظریئے اور اخلاقی تصورات کبھی روبہ عروج اور کبھی زوال پذیر، کبھی صحت مند اور کبھی بیمار ذہنیتوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتے رہے۔ مفکر وحدت الشہود[1] (ہمہ از اوست) اور وحدت الوجود[2] (ہمہ اوست) کے مسئلوں میں اُلجھے رہے اور دستکاروں اور تاجروں سے تعلق رکھنے والے عالموں اور صوفی منش بزرگوں کی اتحاد، صلح اور زرعی اصلاح کی تحریکوں کا عملی طور پر انجام نئے شاہی خاندانوں کا قیام یا نئے مذہبی فرقوں کا نشو و نما ہوا۔

---

[1] وحدت الشہود کا نظریہ ہر شاہی خاندان کے اُس دورِ عروج میں مقبول ہوتا تھا، جب زوال پذیر شاہی خاندانوں سے طاقت و اختیارات چھین کر نئے حکمراں اپنی حکومت قائم کرتے اور دوسرے

برعکس اس کے مغربی یورپ کے نوخیز سرمایہ داروں نے صنعت و تجارت کی ترقی کے لئے ہسپانیہ کے ابن رشد (ایویروز) کے فلسفہ، کوفہ کے رہنے والے ابو موسےٰ جعفر (جیبر) کے الکیمیا، حسن بن ہیثم (الہیزن) اور ابن باجا (ایون پیس) کے علم الہئیت اور بخارا کے ابن ابی سینا (ایوی سینا) اور سپین کے ابن زہر (ایون زور) کے علم طب کی بنیادوں پر مزید تحقیق و تفتیش کی۔

انہوں نے صنعت اور تجارت کو ترقی دے کر دیہات کو شہروں کا محتاج اور دست نگر بنایا، جاگیرداروں کی اقتصادی اور سیاسی طاقت کو ختم یا کمزور کر کے جدید سرمایہ داری نظام قائم کیا، اور مشرقی ممالک کو مغربی یورپ کا محتاج اور دست نگر بنانے کے لئے راس اُمید کے گرد جہازرانی شروع کی، جس سے مشرقی اور مغربی ممالک کے درمیان تجارت کی اجارہ داری مسلمانوں سے چھن گئی اور ایشیائی ممالک میں قدیم تجارتی راستوں پر آباد صنعتی اور تجارتی شہروں اور ایشیا کی مطلق العنان بادشاہتوں پر انحطاط و

ملکوں کو فتح کر کے مرکزی حکومت کو مضبوط بناتے اور اپنے وفادار افسروں، رشتہ داروں اور قبائلی سرداروں کو جاگیریں عطا کرتے، عہدے دیتے اور صوبائی گورنر مقرر کرتے تھے۔ وحدت الشہود کا نظریہ ان حالات کی صحیح عکاسی اور ترجمانی کرتا تھا۔

۲؎ وحدت الوجود کا تصور اُس زمانے میں مقبول ہوتا تھا جب حکومت کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے بادشاہ پُرانے جاگیرداروں سے رابطہ پیدا کر کے اپنی بادشاہت کو مقامی یا قومی بادشاہت بنانے کی کوشش کرتے تھے اور جب حاکم و محکوم کی تہذیبوں کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے سے ایک نئی مشترکہ تہذیب نشو و نما پانے لگتی تھی۔ اتحاد و یکجہتی کے جذبوں کو ابھارنے کے لئے اُس زمانے میں وحدت الوجود کا تصور موثر ہتھیار تھا۔ زوال کے دور میں عالم کی بے ثباتی سے متاثر مردہ دل رہبانیت کے جذبوں کو ابھارنے میں تسکین پاتے تھے اور وحدت الوجود کی بنیادوں پر رجحان تصوف کی طرف بڑھتا تھا۔

زوال کے بادل منڈلانے لگے۔

تجارت پر قبضہ کے ساتھ ہی ساتھ ایشیا پہ سیاسی تسلط قائم کرنے کے لئے مغربی یورپ کے سرمایہ داروں نے دغا، فریب، ڈرا کی باہمی مخاصمت، لوٹ مار، عہد شکنی اور مسلح جنگ غرضیکہ سب ہتھیار استعمال کئے، اور مطلق العنان بادشاہتوں کو گرا کر یا کمزور کر کے سب طاقت و اختیارات خود سنبھال لئے اور تجارت کی راہ میں حائل دیہات کے خود کفیل پنچایتی نظام کو توڑنے کے لئے زمین کو جو کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی، افراد کی شخصی ملکیت قرار دے دیا اور پرانی قسم کے ایشیائی جاگیرداری نظام کو ختم کر کے یورپ کے زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرح ایشیائی ممالک میں بھی زمینوں کے مالک بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار پیدا کئے اور کاشتکاروں کو جواب تک آزاد کاشتکار تھے، مزارعوں اور کھیت مزدوروں میں تبدیل کر دیا۔

دغا، فریب، ڈاکہ زنی سے ملتی جلتی تجارت، شاہی خزانوں کی کھلم کھلا لوٹ وغیرہ سے جمع کی ہوئی دولت سے مغربی یوروپ بالخصوص انگلستان کے سرمایہ داروں نے دیو ہیکل مشینیں ایجاد کر کے صنعتی پیداوار میں انقلاب برپا کیا۔ اور یورپ کے کارخانوں کی بنی ہوئی سستی چیزیں مشرقی ممالک میں فروخت کر کے شہروں کی قدیم صنعت اور خود کفیل دیہات کی گھریلو صنعت کو تباہ کر دیا۔ غرضیکہ یورپ کے سرمایہ داروں نے مشرقی ممالک کے زرعی نظام کو تبدیل کیا اور دیہات اور شہروں کی صنعت کو تباہ کر کے مشرقی ممالک کو مغربی یورپ کا محتاج اور دست نگر بنا لیا۔

مشرق پر مغرب، ایشیا پر یورپ اور مسلمانوں کی حکومتوں پر یورپ کی عیسائی حکومتوں کی یہ فتح درحقیقت فرسودہ اور بوسیدہ جاگیرداری نظام پر جدید سرمایہ داری نظام کی فتح تھی۔ انگریزی تسلط سے پہلے ہندوستان میں تقریباً سب کی سب تجارت ہندو تاجروں کے قبضہ میں تھی، مسلمان تاجر صرف گجرات، کاٹھیاواڑ اور بمبئی میں تھے، چنانچہ

مجموعی طور پر ہندو تاجروں اور گجرات، کاٹھیاواڑ اور بمبئی کے مسلمان تاجروں نے ہندوستان کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام میں اس تبدیلی کا، جس نے بدنظمی اور طوائف الملوکی کو ختم کرکے امن قائم کیا تھا خیر مقدم کیا اور اپنے آپ کو نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالا مگر مراکش سے لے کر انڈونیشیا، ملایا، برما اور منگولیا تک مجموعی طور پر مسلمان چونکہ قرون وسطٰی کی صنعت، تجارت اور جاگیرداری نظام یعنی اس اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام سے تعلق رکھتے تھے، جس کے خلاف اُس زمانے میں یورپ کے جدید سرمایہ دار برسرپیکار تھے اس لئے فرسودہ جاگیرداری نظام کے خلاف جدید سرمایہ داری نظام کی جنگ کو مسلمانوں نے عیسائیوں کی مسلمانوں سے دیرینہ عداوت کا مظہر سمجھا اور جاگیرداری نظام کے زوال کو مسلمانوں کا زوال سمجھتے ہوئے اس زوال کا سبب حقیقی اسلام سے انحراف تصور کیا۔

ان خیالات کا اظہار سب سے پہلے ۱۴ویں صدی عیسوی میں عرب مفکر امام ابن تیمیہ نے کیا۔ آپ اُس زمانے میں پیدا ہوئے تھے، جبکہ چھ سات سو سال حکمران رہنے کے بعد مسلمانوں کو جو عموماً عرب تھے ہسپانیہ سے قتل عام کے بعد نکال دیا گیا تھا، جبکہ مسلمانوں کی حکومتوں میں عربوں کا اثر و اقتدار برائے نام بھی نہ رہا تھا اور جبکہ راس امید کے گرد جہازرانی شروع ہونے سے مشرقی اور مغربی ممالک کے درمیان سمندری تجارت عربوں کے قبضہ سے نکل چکی تھی جس پر کہ تین ہزار سال سے ان کا مکمل اجارہ تھا۔ امام ابن تیمیہ نے عربوں کے زوال کو مسلمانوں کا زوال سمجھا اور حقیقی اسلام سے انحراف کو اس زوال کا سبب قرار دیتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا کہ غیر اسلامی (مراد غیر عربی) عقائد، رسم و رواج تصورات اور اخلاقی قدروں کو اپنانے سے مسلمان اس اسلام کو چھوڑ چکے ہیں جو رسالت اور خلافت راشدہ کے عہد میں مدینہ میں تھا۔ چنانچہ وہی پہلی عظمت اور عروج حاصل کرنے کے لئے اسلام سے غیر اسلامی عقائد اور تصورات کو خارج کرنا اور خلافت راشدہ

کے زمانہ کا نظام ایسا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام ایک مرتبہ پھر قائم کرنا ضروری ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی قیصر وکسریٰ کے نقش قدم پر چلنے کو مسلمانوں کے زوال کا سبب سمجھا اور اس بات کا صحیح اندازہ لگایا کہ سلطنت مغلیہ کے مٹ جانے کے دن قریب ہیں اور اب اُسے کوئی طاقت زندہ نہیں رکھ سکتی، مگر انہوں نے روہیلوں کو سدبہ عروج طاقت خیال کرنے میں غلطی کی۔ انہوں نے اس حقیقت کو محسوس نہیں کیا کہ صرف سلطنت مغلیہ نہیں کل دنیا کا جاگیر شاہی نظام مرض الموت میں مبتلا ہو چکا ہے، اب کوئی طاقت اس نظام کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی، بہرکیف نگاہیں انکی بھی رسالت اور خلافت راشدہ کے نظام کی طرف اٹھیں۔

کل دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ حاکم اور محکوم قوموں اور طبقوں کے درمیان جدوجہد صرف معیشت اور سیاست کے میدان تک محدود نہیں رہتی، محکوم قومیں اور طبقے حاکموں کی تہذیب، مذہبی عقائد، فلسفیانہ تصورات اور اخلاقی اقدار کے خلاف بھی جدوجہد کرتے ہیں۔ قدیم سلطنت روما کے حکمرانوں کے خلاف غلاموں، کاشتکاروں اور دستکاروں کی جنگ نے قدیم رومی مذہب کے خلاف عیسائیت کو فروغ دیا۔ کیتھولک کلیسا نے مطلق العنان بادشاہت کی حمایت کی تو جدید سرمایہ داروں نے پروٹسٹنٹ ازم کو قبول کیا۔ پرانے ادب کے مقابلہ میں نئے ادب کی حوصلہ افزائی کی اور شاہ کے ظل اللہ ہونے کے نظریہ کے خلاف عوام کی حاکمیت کا نظریہ پیش کیا۔

تاریخ عالم اس بات کی بھی شاہد ہے کہ حکمران اگر ایک ترقی یافتہ اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام کے نمائندے اور ایک اصلاح یافتہ مذہب کے پیرو ہوں تو محکوم قومیں اور قبیلے قدیم مذہبی عقائد، فرسودہ رسم و رواج اور دقیانوسی تصورات

کو اپناتے ہیں اور انہی کی بنیادوں پر حکمرانوں کے خلاف اپنی جدوجہد کو موثر بنانے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں کے تسلط کے خلاف جدوجہد کو موثر بنانے کے لئے ہندو جاگیرداری اصنام پرستی رہی اور وحدانیت کی طرف قدم نہیں بڑھایا۔ سپین میں مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لئے مقامی جاگیرداروں نے عیسائیت کا جھنڈا بلند کیا۔ آئرلینڈ کے وطن پرستوں نے پروٹسٹنٹ انگریز حکمرانوں کے خلاف جدوجہد میں جو تقریباً چار سو سال جاری رہی کیتھولک کلیسا کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا۔ خوارجیوں نے جو یمنی ہونے کے سبب حجازی عربوں کے اقتدار کے مخالف تھے علویوں، امویوں، عباسیوں غرضیکہ تمام بنو قریش کیخلاف جنگ کو موثر بنانے کے لئے رسالت اور پہلے دو خلفاء راشدین کے عہد کے نظام حکومت، قبائلی دور کی سادگی اور مساوات نیز مسند خلافت کے لئے قریش اور غیر قریش، عرب اور غیر عرب غرضیکہ ہر مسلمان کے حق کا پروپگنڈا کیا۔ اور عربوں کے اقتدار کے خلاف مغضب و متمدن ایرانیوں کی جدوجہد انھیں شیدایان علی کی صفوں میں لے گئی یہی بات فرمودہ جاگیرشاہی پر جدید سرمایہ داری کی فتح کے موقعہ پر مسلمانوں میں موثر تاجر طبقہ کی غیر موجودگی یا کمزوری کے سبب مسلمانوں نے آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف دیکھا۔ اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کی بنیادیں دور گذشتہ کی عظمت کے تصور پر رکھیں۔

"جہاد فی الاسلام" کے جنگجویانہ نعرے کے ماتحت یورپی حکمرانوں کے خلاف مسلمانوں کی ان پہلی بغاوتوں کے رہنما علماء تھے اور ان بغاوتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں ایک تو وہ قبیلے تھے جنھیں نئے حکمرانوں نے ان کی چراگاہوں، زمینوں وغیرہ سے محروم کرنا شروع کر دیا تھا، دوسرے وہ دستکار اور تاجر تھے، جنھیں یورپ کے کارخانوں کی تیار شدہ اشیاء تباہ و برباد کر رہی تھیں اور تیسرے وہ کاشتکار تھے جنھیں

زمینوں سے محروم کر کے جاگیردار عملی طور پر فرمانبردار بنا رہے تھے۔ بڑے بڑے جاگیرداروں، نوابوں، خانوں اور سلطانوں نے عموماً ان بغاوتوں میں نئے حکمرانوں کا ساتھ دیا، اور بہت ہی کم ان میں ایسے تھے جنھوں نے یورپی حکمرانوں کے خلاف اپنے ہموطنوں یا ہمذہبوں کا ساتھ دیا۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں دریائے والگا کے مشرق میں آباد مویشی پال کر گذارہ کرنے والے باشکیریوں (ترک قبیلوں) کی بغاوت دراصل اُن قبیلوں کی بغاوت تھی جنھیں زار کی حکومت ان کی چراگاہوں سے محروم کر کے زمین روسی جاگیرداروں کو دے رہی تھی۔ یہ بغاوت مُلا بطروش کی رہنمائی میں ہوئی جس نے تحفظ اسلام اور باشکیریوں کی آزادی کے لئے زار کی حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور جو چھاپہ مار دستے منظم کر کے روسی فوجوں کے خلاف دو سال تک جنگ کرنے کے بعد گرفتار ہوا اور سینٹ پیٹرزبرگ (اب لینن گراڈ) کے جیل خانے سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک سپاہی کی بندوق کی گولی کا نشانہ بنا۔

شمالی اور شمال مغربی قفقاز کے ایک پہاڑی خطہ داغستان پر ۱۸۲۰ء میں قبضہ کرنے کے بعد جب زار کی حکومت نے کاشتکاروں پر ٹیکسوں کے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیا تو مُلا کاظم نے اسلام کے نام پر جہاد کا اعلان کیا اور داغستانی کاشتکاروں نے جو ترک تھے مُلا کاظم کے مرید مُلا اسماعیل کی سرکردگی میں مسلح بغاوت کر کے ۱۸۳۰ء میں اپنی حکومت قائم کر لی، اور زار روس کی طاقت کے ساتھ ہی ساتھ داغستانی جاگیرداروں، خانوں اور بیگوں کی طاقت کو بھی ختم کر دیا۔ زار کی فوجوں نے یکے بعد دیگرے کئی حملے کئے، مگر مسلح پہاڑی کاشتکاروں کو شکست دینے میں ناکام رہیں۔ جدوجہد مُلا اسماعیل کی گرفتاری (۱۸۵۹ء) کے بعد مُلا کاظم کے ایک دوسرے مرید مُلا امین کی سرکردگی میں جاری رہی زار کی فوجوں نے بڑے بڑے ظلم کئے۔ چار لاکھ کاشتکار اپنی مویشی فروخت کر کے

کشتیوں پر سوار ہوئے اور ترکی چلے گئے، مگر شکست قبول نہیں کی۔

وسط ایشیا پر زار کے مکمل تسلط کے فوراً ہی بعد ۱۸۶۸ء میں سمرقند اور ۱۸۷۵ء میں خوقند کے تاجروں اور دستکاروں نے منظم ہو کر مسلح بغاوت کی اور ایک مرتبہ روسی فوجوں کو علاقے سے نکال دیا۔ یہ بغاوتیں جو روسی فوجوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں دبا دیں ملا عبدالرحمان آفتابچی کی رہنمائی میں ہوئیں جس نے کافر روسیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں اندیجان (فرغانہ) کے علاقہ میں آباد ازبک اور کرغی کاشتکاروں نے بغاوت کی۔ یہ کاشتکار پہلے آزاد تھے، مگر روسی تسلط کے بعد ازبک اور روسی جاگیرداروں کے مزارعہ بنا دیئے گئے تھے۔ یہ بغاوت جو ملا محمد علی کی رہنمائی میں ہوئی روسی فوجوں نے بڑی سختی سے دبا دی۔ بغاوت کے اکیس رہنماؤں کو جن میں محمد علی بھی تھے، پھانسی کی سزا ملی، اور اس بغاوت میں حصہ لینے والے ۸۲۲ ازبک اور کرغی کاشتکاروں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ اسی نوعیت کی بغاوتیں کازخستان اور آذربائجان میں بھی روسی تسلط کے بعد ہوئیں جنھیں روسی فوجوں نے دبا دیا۔

امام ابن تیمیہ کے خیالات اور تصورات کی بنیادوں پر وہابیوں کے امام عبدالوہاب نے اٹھارویں صدی میں وہابی تحریک شروع کی اور انیسویں صدی کے شروع میں اس تحریک کے رہنما ابن سعود کی سرکردگی میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے حجاز پر قبضہ کر لیا۔ اس بغاوت کا مقصد جسے مصر کے محمد علی پاشا نے دبا دیا ترکوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ کم و بیش یہی کیفیت شمالی افریقہ میں شیخ سنوسی کی تحریک تھی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں بنگال کے مولوی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک در اصل جدید ہندوستان میں پہلی کسان تحریک تھی۔ یہ ان مسلمان بنگالی کسانوں کی تحریک تھی جنھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور اس کے ملازموں کی عریاں، حیا سوز اور براہ راست لوٹ کھسوٹ اور بنگال کے دوامی بندوبست کے پیدا کردہ نئے جاگیرداروں

اور زمینداروں کے وحشیانہ استحصال نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ مولوی شریعت اللہ کے بعد ٹیٹو میاں کی سرکردگی میں اس تحریک نے ۱۸۳۲ء میں بنگال کے کئی اضلاع میں کھلم کھلا بغاوت کی شکل اختیار کی اور اسے دبانے کے لئے انگریزی فوج کے دو تین سال صرف ہوئے۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل کی سرکردگی میں بنگال اور بہار سے ۱۸۲۶ء میں پیدل سفر کر کے بہاولپور ہو کر درہ بولان سے افغانستان اور وہاں سے درہ خیبر سے گذر کر سرحدی پٹھانوں کو سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے ابھارنے اور پشاور پر قبضہ کر کے ۱۸۳۰ء میں شرعی حکومت قائم کرنے والوں میں بنگالی کسانوں کے علاوہ بنگال اور بہار کے دستکار بھی تھے جن کی صنعت کو انگلستان کے کارخانوں کی تیار شدہ چیزوں نے برباد کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ حکومت پٹھانوں کے بگڑ جانے سے ایک سال بھی قائم نہ رہی اور شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید ضلع ہزارہ میں بالاکوٹ پر رنجیت سنگھ کی سکھ فوجوں سے لڑتے لڑتے مئی ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے بعد پٹنہ کے محلہ صادق پور کے مولانا ولایت علی اور عنایت علی کی تحریک بھی جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے، دستکاروں کی تحریک تھی قدیم صنعت کی تباہی سے وہ دستکار جو دیہات سے ناطہ رکھتے تھے شہروں کو چھوڑ کر دیہات کو جا رہے تھے، اور جو دستکار دیہات سے تعلق توڑ چکے تھے، وہ شہروں میں بے روزگاروں کی تعداد بڑھا رہے تھے۔ چنانچہ بے چینی پھیل رہی تھی اور نئے حکمرانوں کے خلاف نفرت بڑھ رہی تھی۔ صادق پوری علماء نے بنگال سے پشاور تک ہر چھوٹے بڑے قصبے اور شہر میں دستکاروں کو منظم کر کے وہابی تحریک کے خفیہ مرکز قائم کئے اور سرحدی پٹھانوں سے متحدہ محاذ بنا کر ۱۸۶۳ء تک اول سکھوں اور بعد میں انگریزوں کے خلاف کئی مرتبہ مسلح جنگ کی۔

غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف "دار الحرب" اور "دار الاسلام" کے نظریوں اور "فرنگی"

حکومت سے نفرت اور اُس کی "ملحدانہ" تعلیم کے مقاطعہ کی بنیادوں پر علماء کی سرکردگی
میں کاشتکاروں، دستکاروں وغیرہ کی پرانی طرز کی انتہا پسند تحریکیں اور مسلح بغاوتیں
ناکام ہوئیں اور ایک طرف حکومت کے تشدد اور دوسری طرف حالات میں تبدیلی سے
رفتہ رفتہ مذہبی فرقوں میں تبدیل ہو گئیں۔

مغربی یورپ کے سرمایہ داروں نے مقبوضہ ایشیائی ممالک میں اپنے کارخانوں کے لئے
کچا مال حاصل کرنے اور اِن کارخانوں کی تیار شدہ اشیاء کو فروخت کرنے کے لئے دیہات
کے خود کفیل پنچایتی نظام کو درہم برہم کیا۔ زمین کو افراد کی شخصی ملکیت اور خرید و فروخت
کی شے بنایا۔ شہروں کی صنعت اور خود کفیل دیہات کی گھریلو صنعت کو تباہ کیا۔ جدید صنعت
کو ترقی کرنے سے روکا اور وطن پرستی کے جذبہ کو سختی سے دبایا۔ انھوں نے کاشتکاروں
کو اپنی زمینوں اور دستکاروں کو اپنے اوزاروں اور ورکشاپوں سے محروم ہو کر مزدور بننے
کے لئے مجبور کیا، مگر جدید صنعت کو ترقی کرنے سے روک کر شہروں میں ان کے لئے روزگار
پیدا کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے دیسی تاجروں کو
کمیشن ایجنٹ بن کر روپیہ کمانے کی اجازت دی مگر جب ان کے پاس روپیہ جمع ہو گیا تو اُسے
کارخانوں اور کانوں میں لگانے سے روکا۔ انہوں نے سرکاری دفاتر میں کم سے کم تنخواہ
پر کام کرنے والے کلرک پیدا کرنے کے لئے نوجوانوں کو جدید علوم کی تعلیم دی، مگر روسیو،
والٹیر، ڈارون اور ملز کے جدید جمہوری نظریوں کے مطابق مقبوضہ ممالک میں عوام کی نمائندہ
حکومت قائم کرنے کی تمام کوششوں کو سختی سے دبایا۔ غرضیکہ غیر ملکی سرمایہ داروں نے مقبوضہ
ایشیائی ممالک میں پرانے نظام کو درہم برہم کر کے سماج کو سرمایہ داری نظام کے سانچے
میں ڈھالا، مگر اس نظام کو اپنے لاؤ لشکر سمیت زندگی کے ہر شعبہ پر مسلط ہونے سے روکا اور
محکوم ملکوں میں اپنے اس نو آبادیاتی نظام کو مضبوط و مستحکم رکھنے کے لئے جاگیردار اور بڑے
زمیندار پیدا کئے اور نوابوں، راجوں، بیگوں، سلطانوں وغیرہ کی سیاسی و فوجی طاقت

کو کمزور یا ختم کرکے اِن سب کو اپنی حکومت کے ستون کی حیثیت سے مصنوعی طور پر قائم رکھا۔ چنانچہ ان محکوم ایشیائی ممالک میں جس طرح دورِ قدیم کے اوزاروں، ہتھیاروں اور نقل و حمل کے وسیلوں کے پہلو بہ پہلو دورِ جدید کے اوزار، ہتھیار اور نقل و حمل کے وسیلے رواج پلئے، اسی طرح دورِ قدیم سے اب تک تمام تاریخی ادوار کی نمائندگی کرنیوالے خیالات، عقائد، رسم و رواج، سیاسی نظریات اور اخلاقی اقدار موجود ہیں

غیر ملکی حکومت کے ستون جاگیرداروں، تعلقہ داروں، بڑے زمینداروں اور نوابوں کے فرزند جدید تعلیم حاصل کرکے سامراجی نظام کو سب سے بہتر نظام اور سامراجی حکومت کو سب سے بہتر حکومت قرار دے کر مغربی تہذیب کے پرستار بننے لگے۔ برعکس اس کے سامراجیوں کے قائم کردہ نظام میں محکوم ملکوں کے دستکاروں اور درمیانہ درجہ کے مالک کاشتکاروں کا چونکہ ہر قدم تنزل اور اقتصادی و مالی بربادی کی طرف تھا۔ اس لئے پرانی طرز کی انتہا پسند تحریکوں اور بغاوتوں کی ناکامی کے بعد بھی ایک طویل عرصہ تک گذشتہ عظمت کا تصور مسلمانوں کے سامراج دشمن جذبوں کو ابھارتا رہا۔

قدیم اور جدید نظریات کے پہلے آپس میں تصادم، پھر ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے اور اس کے بعد ایک دوسرے کی طرف بڑھنے سے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک نئی تحریک کی ابتدا ہوئی۔ یہ تحریک نئے طرز کی جمہوری آزادی کو عین اسلام حتیٰ کہ ترکی میں ۱۹۰۹ء کے دستوری انقلاب کو "وامرہم شوریٰ بینہم" کی سچی تعبیر قرار دینے لگی تھی۔ ہندوستان میں اس تحریک کے رہنما علامہ شبلی، مولانا محمود الحسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابو الکلام آزاد وغیرہ تھے۔ جنھوں نے اپنی تصانیف اور مضامین میں اسلام کے جمہوری اصولوں کو ابھارا اور غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف آزادی کی ان تحریکوں کی باگ ڈور بھی اپنے ہاتھ میں لی جو بلقان ایجی ٹیشن، خدام کعبہ اور خلافت کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا ایک بڑا مقصد مرض الموت میں مبتلا سلطنت ترکی کو بچانا تھا جسے

روس میں بالشویک انقلاب سے پہلے زار روس، جرمنی، برطانیہ اور فرانس اور پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور فرانس آپس میں بانٹ کر شکم ہستی سے شمار ہے تھے۔ ان تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ شہروں کے دستکاروں اور چھوٹے چھوٹے تاجروں اور انکے بیروزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں نے لیا۔ جاگیردار، بڑے زمیندار اور اونچے تاجر ان تحریکوں کے مخالف تھے۔ انہوں نے حکومت کا ساتھ ان تحریکوں کو دبانے میں دیا۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے تجارت کے میدان میں قدم اس وقت رکھا جب غیر مسلم بالخصوص ہندو تاجر بڑے بڑے کارخانوں، تجارتی فرموں، انشورنس کمپنیوں اور بنکوں کے مالک یا ڈائرکٹر بن چکے تھے۔ چنانچہ قلیل سرمایہ اور ناتجربہ کاری کے سبب مسلمان تاجران کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں ایک مخصوص منڈی درکار تھی جس میں نہ صرف ان کا سرمایہ محفوظ ہو بلکہ دن دگنا اور رات چوگنا بڑھے۔ اسی طرح مسلمان نوجوان جدید تعلیم حاصل کرکے سرکاری دفاتر کے دروازوں پر پہونچے تو نہ صرف خالی اسامیاں محدود تھیں بلکہ ملازم ہونے اور ترقی کرنے کے لئے انھیں مقابلہ اُن سے کرنا پڑتا، جو زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ تجربہ کار تھے۔ انھیں ایسا ملک چاہئے تھا جہاں سرکاری ملازمتیں صرف ان کے لئے مخصوص ہوں۔ یہی حال وکیلوں، ڈاکٹروں وغیرہ کا تھا۔

۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات اور ۱۹۲۰-۲۱ء کی خلافت اور کانگریس تحریکوں نے جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کو اپنے حقوق و مراعات نیز سامراجی مفاد کی حفاظت کے لئے اپنی پارٹیاں بنانے کے لئے مجبور کیا اور ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں کانگریس کی کامیابی سے گیارہ صوبوں میں سے نو صوبوں کی وزارتیں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے قبضہ سے نکل گئیں اور سارے ہندوستان میں کسانوں اور مزارعوں نے منظم ہو کر جاگیرداری اور بڑی زمینداری کی تنسیخ کا مطالبہ بلند کرنا شروع کیا تو مسلمان جاگیرداروں

اور بڑے زمینداروں نے بھی مسلم لیگ میں شامل ہو کر ایک ایسے وطن کی ضرورت محسوس کرنی شروع کی، جس میں حکومت ان کی اپنی ہو اور جس میں جاگیرداری اور بڑی زمینداری کی تنسیخ کا کوئی خدشہ نہ ہو۔

چنانچہ تاجروں، سرکاری اور غیر سرکاری ملازموں، وکیلوں، ڈاکٹروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی حمایت اور شمولیت سے مضبوط و مستحکم ہو کر مسلم لیگ نے اپریل ۱۹۴۰ء میں پاکستان کا مطالبہ کیا، اور اس مطالبہ کی حمایت میں مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے مذہبی، سیاسی اور تہذیبی رہنماؤں نے یہ اعلان کرتے ہوئے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہوگی۔ ایک ہی سانس میں ذکر پیغمبر اسلام خلفاء راشدین اور صحابہ کرام کی سادگی، مساوات، اخوت، جمہوریت پسندی اور اخلاق حسنہ کا کیا، تعریفیں اموی اور عباسی خلفاء اور دوسرے بادشاہوں کے جاہ و جلال، شان و شوکت اور رعب داب کی کیں اور مخالفوں کو ڈرانے کے لئے دھمکیاں چنگیز اور ہلاکو بن کر دکھانے کی دیں۔ مسلم عوام موجودہ حالات سے بیزار تھے اور آزادی چاہتے تھے انہوں نے پاکستان کے مطالبہ کو اپنی آزادی کا مطالبہ سمجھا اور مسلم لیگ کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی چین، ویت نام، انڈونیشیا، ملایا، ہندوستان، ایران غرضیکہ تمام محکوم ایشیائی ممالک میں عوامی آزادی کی تحریکوں کا دور شروع ہوا انگریز سامراجی اقتصادی، سیاسی اور فوجی اعتبار سے کمزور ہو چکے تھے۔ ان کے لئے ہندوستان میں اپنی براہ راست حکمرانی قائم رکھنا مشکل اور ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ عوامی تحریکوں کو دبانے اور اپنے اقتصادی، سیاسی اور فوجی اقتدار کو بدستور قائم رکھنے کے لئے انھوں نے کانگریس کے چند بڑے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور مسلم لیگ کے چند بڑے تاجروں اور جاگیرداروں سے سمجھوتہ کر کے ملک کو ہندوستان اور پاکستان

دو ملکوں کو اس طریقہ سے تقسیم کیا کہ دونوں ملک اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے کمزور ہو گئے اور دونوں ملکوں میں تجارتی اور سیاسی ایسے جھگڑے پیدا کر دیئے کہ دونوں انگریزوں کے محتاج اور دست نگر رہیں اور کوئی بھی انہیں سلطنت برطانیہ سے اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے آزاد ہونے کی جرأت نہ کرے۔

اسلامی ریاست کے مطالبہ کی بنا پر پاکستان کے نام سے جو ریاست وجود میں آئی ہے، وہ پاکستانی عوام کی آزاد اور خود مختار ریاست نہیں بلکہ انگریز سامراجیوں کی ایک محکوم ریاست ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے انگریز حکومت کرتے صاف دکھائی دیتے تھے، اب پردوں کے پیچھے بیٹھے ملک کی اقتصادی، سیاسی اور فوجی پالیسی کو کنٹرول کر رہے ہیں اور وزارت کی کرسیوں پر ان جاگیرداروں اور بڑے تاجروں کے نمائندے بیٹھے ہیں جنھیں انگریز سامراجیوں نے پالا پوسا اور خصوصی مراعات کے انجکشنوں سے زندہ رکھا ہے۔

اس ریاست میں جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کو کامل آزادی ہے۔ جس قدر چاہیں مزارعوں اور غریب کسانوں کا خون چوس سکتے ہیں۔ اس ریاست میں بڑے تاجروں کے چند خاندانوں کو غیر ملکوں سے مال درآمد کر کے من مانی قیمتوں پر فروخت کرنے اور چار پانچ گنا زیادہ نفع حاصل کرنے کی کامل آزادی ہے۔ اس ریاست میں بڑے سرکاری افسر اپنی قابلیت کی بناء پر جن کرسیوں پر کبھی بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے، اب بیٹھے ہیں اور انکی تنخواہیں پہلے سے دگنی ہو گئی ہیں۔ جہاں تک مزدوروں، کسانوں، دستکاروں اور درمیانہ اور نچلے درجے کے تاجروں اور کلرکوں کا تعلق ہے ان کا معیار زندگی لگاتار گر رہا ہے۔

مسلم لیگی علماء پاکستان کی موجودہ ریاست کو "اسلامی ریاست" اور "وامرہم شوریٰ بینہم" کی صحیح تعبیر قرار دیتے ہیں اور جب سے پاکستان کی مجلس دستور ساز نے ایک

قرارداد پاس کرکے پاکستان میں "خدا کی حاکمیت" کا اعلان کیا ہے، مولانا مودودی کی جماعت اسلامی بھی جو اسے "لادینی" اور "غیر اسلامی" ریاست سمجھتی تھی، اب "اسلامی ریاست" قرار دیتی ہے۔ اعتراض صرف پاکستان کی موجودہ حکومت پر ہے۔ اُسے وہ اب بھی "غیر اسلامی" حکومت سمجھتی ہے۔

ریاست جس سے مراد نظام حکومت ہے، کوئی مقدس چیز نہیں ہے اور نہ وہ ہمیشہ سے قائم ہے، اُس کا نشوونما سماج کے طبقوں میں بٹ جانے سے ہوا اور اس وقت نہیں رہے گی جب سماج میں طبقے نہیں رہیں گے۔

ریاست جو سماج کی مختلف طبقوں میں تقسیم سے وجود میں آئی برسراقتدار طبقے کے ہاتھ میں ہمیشہ دوسرے طبقوں کو دبانے کا ہتھیار رہی ہے۔ ریاست اور حکومت میں کوئی فرق اور کوئی تضاد نہیں۔ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں، ریاست نظری اور تصوری پہلو ہے اور حکومت ظاہری اور عملی پہلو۔ جیسی ریاست ہوگی، ویسی ہی حکومت ہوگی۔ جب سے ریاست وجود میں آئی ہے، یہی ہوا ہے۔

غلامی کے دور میں ریاست خواہ اُس کی تشکیل شہری ریاست تھی، سپہ سالاروں کی آمریت یا مطلق العنان بادشاہت غلاموں کو دبانے کے لئے غلام داروں کے ہاتھ میں طبقاتی ہتھیار تھی۔ قرون وسطےٰ میں ریاست ہر ملک میں جاگیرداروں کی ریاست تھی اور شاہی دربار ان کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے اور کاشتکاروں اور تاجروں کو دباتے تھے۔ سرمایہ داری کے دور میں ریاست خواہ جمہوری ہو، فاشسٹ یا محدود آئینی بادشاہت اور خواہ برسراقتدار پارٹی کنسرویٹو ہے، لبرل یا لیبر، سرمایہ دار طبقے کے مفاد و حقوق کی حفاظت کرتی اور محنت کش طبقوں کو دباتی ہے۔ سوویٹ یونین میں سوویٹ ریاست اور حکومت بھی ایک طبقاتی ہتھیار ہے۔ وہ محنت کش طبقوں کے مفاد و حقوق کی حفاظت کرتی اور ان کے مخالف طبقوں کو دباتی ہے۔

تقسیم سے پہلے ہندوستان میں حکومت انگریز سرمایہ داروں کی تھی، اور وہ اپنے پیدا کردہ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی مدد سے اس ملک کی زرعی، صنعتی، سیاسی اور تہذیبی ترقی کو روکتے اور مزدوروں، کسانوں، درمیانہ طبقوں اور بڑے بڑے تاجروں کو دباتے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں تبدیلی صرف یہ ہوئی ہے کہ حکمران طبقہ انگریز اور امریکی سامراجیوں کے دست نگر اور محتاج بڑے تاجروں، جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں پر مشتمل ہے۔ اور جہاں تک اس ملک کی ریاست کا تعلق ہے وہ بدستور انگریز اور امریکی سامراجیوں کی محکوم اور دست نگر نیم سرمایہ داری اور نیم جاگیرداری ریاست ہے۔ مولا مودودی کو مسلم لیگی علماء سے اتفاق ہے کہ پاکستان کی موجودہ نیم سرمایہ داری اور جاگیرداری ریاست، جس میں محدودے چند جاگیرداروں، زمینداروں، اور بڑے تاجروں کے علاوہ باقی سب کی حالت بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ "اسلامی ریاست" ہے۔

اگر قرارداد مقاصد میں "خدا کی حاکمیت" کا محض اعلان کر دینے سے انگریز اور امریکی سامراجیوں کی ایک محکوم ریاست "لادینی ریاست" سے "اسلامی ریاست" میں تبدیل ہو سکتی ہے تو کیوں جماعت اسلامی کے علما بنو امیہ سے لے کر اب تک مسلمانوں کی تمام ریاستوں کو "غیر اسلامی حکومتیں" قرار دیتے ہیں جب کہ سب شاہی خاندان "خدا کی حاکمیت" کو مانتے ہوئے اپنے آپ کو پیغمبر اسلام کے خلیفہ کہتے تھے۔

درحقیقت جماعت اسلامی کے مولوی بھی جاگیرداروں، زمینداروں اور بڑے تاجروں کے مفاد و حقوق کی حفاظت کرتے ہیں، پاکستان کی موجودہ ریاست کو "اسلامی ریاست" قرار دینے کا اصل سبب یہی ہے۔ مسلم لیگ سے ان کے اختلاف کی خاصیت وہی ہے جو امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی یا برطانیہ کی کنزرویٹو پارٹی، لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کے درمیان اختلاف کی ہے۔ حکومت سے مولانا

مودودی کی مراد وزارت ہے۔ مسلم لیگی وزارت کی جگہ اگر جماعت اسلامی کے "صالحین" کی وزارت قائم ہو جائے تو مولانا مودودی کا نظریہ بدل جائے گا۔ وہ اس "غیر اسلامی" حکومت کو "اسلامی" حکومت کہنے لگیں گے۔

جاگیرداری اور سرمایہ داری دونوں پر زوال کے بادل چھائے ہوئے ہیں اور جماعت اسلامی اسلام کے سیاسی نظام کے نام سے جس سیاسی نظام کا خاکہ پیش کرتی ہے وہ کوئی دوسرا نظام نہیں وہی نظام ہے جو جاگیردار اور سرمایہ دار اپنے تنزل کے دور میں قائم کرتے ہیں جدید سرمایہ دار اپنے ابتدائی ادوار بالخصوص مطلق العنان بادشاہت کے خلاف جدوجہد کے دوران میں عوام کی حاکمیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے اداروں (مثلاً سیاسی پارٹیوں، کونسلوں، اسمبلیوں، پارلیمنٹوں اور ان کے انتخاب کے اداروں) کو وجود میں لاتے اور انھیں مضبوط بناتے ہیں۔ مگر جب یہ سرمایہ داری نظام اپنے زوال و انحطاط کے دور میں داخل ہوتا ہے اور اقتصادی بحران ایک مستقل اور دائمی صورت اختیار کر لیتا ہے عوام میں بےچینی بڑھتی ہے۔ اور مزدور اور کسان فرسودہ نظام کو بدلنے کیلئے انقلابی جدوجہد شروع کر دیتے ہیں اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ادارے عوامی بےچینی اور جدوجہد کو دبانے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں تو دولتمند حکمران طبقے شہری آزادی، جمہوریت، اخوت اور مساوات کے بلند دعوے چھوڑ کر فاشزم یعنی زردار طبقوں کی برہنہ اور بزور شمشیر حکمرانی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ مزدور اور کسان جتھہ بندیوں، سیاسی پارٹیوں، اسمبلیوں کونسلوں اور پارلیمنٹوں کو توڑ دیتے ہیں۔ ایک ملک، ایک قوم، ایک پارٹی اور ایک رہنما کے نعرے بلند کرتے ہیں اور آمریت قائم کر دیتے ہیں۔ پہلے وزیر، پارلیمنٹیں، اسمبلیاں اور سیاسی پارٹیاں "عوام" کو جوابدہ تھیں اب عوام آمر اور اس کی قائم کردہ حکومت کو جوابدہ بنا دیئے جاتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اٹلی میں مسولینی کی فاشسٹ پارٹی اور ۱۹۳۲ء کے بعد جرمنی میں ہٹلر کی نازی پارٹی نے انہی اصولوں پر اپنی حکومتیں قائم کی تھیں۔

مولانا مودودی اپنی تصانیف[1] میں اسلام کے سیاسی نظام کے نام سے جس سیاسی نظام کا دھندلا سا خاکہ پیش کرتے ہیں، وہ اٹلی کی فاشسٹ حکومت اور جرمنی کی نازی حکومت کا چربہ ہے۔ جماعت اسلامی کی قائم کردہ "اسلامی" حکومت میں نظری طور پر حاکمیت خدا کی ہوگی اور نظم و نسق کی ذمہ داری ایک امیر کے سپرد ہوگی۔ امیر اور اس کی مجلس شوریٰ کے انتخاب میں ہر بالغ کو نہیں بلکہ اُن "صالح" بالغ مردوں اور عورتوں کو رائے دینے کا حق ہوگا جو اسلامی دستور سے نہ صرف متفق ہونگے بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے اور اسکی تفصیلات سے پوری طرح واقف ہوں گے۔

اس ریاست میں قانون بنانے کا اختیار کسی کو نہیں ہوگا۔ جماعت اسلامی کا نظریہ یہ ہے کہ خدا کا بنایا ہوا قانون قرآن میں موجود ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ اُس قانون کی تشریح اور وضاحت صرف وہی اشخاص کر سکتے ہیں جو قرآن و احادیث کے علم پر عبور رکھتے ہیں۔ مجلس شوریٰ کے علماء ممبروں پر مشتمل ایک سب کمیٹی قرآن و احادیث کی روشنی میں قانون الہٰی کے نفاذ کی نگرانی کریگی اور امیر جسے مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مشورے کو رد کرنے کا حق ہوگا، خدا کے خلیفہ ہونیکی حیثیت سے صرف انہی اختیارات کو استعمال کرنے کا مجاز ہوگا جو قرآن و احادیث کی روشنی میں حاکم اعلیٰ یعنی خدا کی طرف سے اُسے تفویض ہیں۔

غرضیکہ "اسلامی حکومت" اور "خدا کی حاکمیت" کے نعروں سے مسلمانوں کو مسحور کرکے جماعت اسلامی پاکستان میں ایک ایسی فاشسٹ حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہے، جس میں عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت کرنے اور

---

[1] مثلاً "اسلام کا نظامِ حیات" اور "اسلام کا نظریہ سیاسی"

اپنی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی ترقی کے لئے قانون بنانے کے حق
سے محروم ہوں گے، جس میں عوامی جمہوریت کا نام و نشان تک نہ ہو گا، جس میں
ایک شخص کی آمریت ہو گی اور قانون بنانے کے سب اختیارات مولویوں
کی ایک فاشسٹ گرانڈ کونسل کو حاصل ہوں گے۔ اس فاشسٹ نظام
حکومت میں جاگیرداری کو منسوخ کرنے، کلیدی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے
اور جاگیرداروں کی وحشیانہ لوٹ کھسوٹ اور بڑے تاجروں کی حیا سوز
نفع خوری پر پابندی لگانے کے لئے آواز بلند کرنا کفر کے مترادف ہو گا۔ جماعت
اسلامی جس اسلامی حکومت کے لئے جد و جہد کر رہی ہے اس کے خد و خال یہی ہیں۔
مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم
کرنے کا نعرہ ایک بار نہیں، کئی بار لگ چکا ہے۔ بنو عباس نے بنو امیہ کو گرانے
کے لئے اسلامی حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا مگر تاج و تخت حاصل کرنے کے
بعد جو حکومت قائم کی وہ بنیادی طور پر بنو امیہ کی حکومت سے مختلف نہ تھی۔
اسی طرح فاطمیوں نے بنو عباس کا تختہ الٹنے کے لئے شمالی افریقہ کے بربر
قبیلوں سے اسلامی حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا مگر طاقت حاصل کرنے
کے بعد جو حکومت قائم کی اس کا ڈھانچہ بنو عباس کی حکومت سے مختلف نہیں
تھا۔ ١٨ ویں اور ١٩ ویں صدی میں مسلمانوں نے انگریز، روسی، فرانسیسی
اور ڈچ حکمرانوں کے خلاف اسلام کے نام پر بغاوتیں کیں اور جہاں کہیں
تھوڑے عرصہ کے لئے کامیابی ہوئی بغاوت کے رہنماؤں نے اسی قسم کی حکومت
قائم کی جس قسم کی "فرنگی" حکمرانوں کے تسلط سے پہلے تھی۔ ہماری اپنی آنکھوں
کے سامنے مسلم لیگی جاگیرداروں، زمینداروں اور بڑے تاجروں نے
اسلامی حکومت قائم کرنے کا پروپگنڈا کیا، مگر پاکستان بننے کے بعد اُسی

نیم سرمایہ داری اور نیم جاگیرداری محکوم نظام حکومت کو "اسلامی نظام حکومت" کہہ کر پیش کیا، جسے انگریز سامراجیوں نے قائم کیا تھا۔

انگریز اور امریکی سامراجیوں کے محکوم اور دست نگر پاکستان کے موجودہ نظام حکومت میں عوام کا ایک بھی مسئلہ حل نہیں ہوا، گھریلو صنعت اور چھوٹی چھوٹی کارخانہ داری تباہ ہو رہی ہے۔ چھوٹے اور درمیانہ تاجر دیوالیہ ہو رہے ہیں، بے روزگاری اور مفلسی بڑھ رہی ہے اور عوام میں بے چینی پھیل رہی ہے۔ چنانچہ حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں اور موجودہ حالات کو بدلنے کے لئے مزدور، کسان، تاجر، دستکار، ملازم اور بیروزگار منظم ہو رہے ہیں، جدوجہد کر رہے ہیں۔ جس طرح پہلی جنگ عظیم کے بعد اقتصادی بدحالی کے دور میں اٹلی کی فاشسٹ پارٹی نے ایک طرف ایک ہی سانس میں جاگیرداری، سرمایہ داری اور کمیونزم کی مذمت کرتے ہوئے اور دوسری طرف قدیم سلطنت روم کی عظمت کے ذکر سے قومی جذبات کو ابھارتے ہوئے تباہ حال تاجروں اور بے روزگار فوجی سپاہیوں کی مدد سے طاقت حاصل کی تھی، جس طرح ۱۹۲۹-۳۲ء کی اقتصادی بدحالی کے دور میں جرمنی کی نازی پارٹی نے سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں کی مذمت کرتے ہوئے نیشنل سوشلزم کو ان دونوں کے درمیان ایک تیسری راہ کی حیثیت سے پیش کر کے تباہ حال تاجروں اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کی حمایت سے طاقت پر قبضہ کیا تھا، اسی طرح آج پاکستان میں جماعت اسلامی چھوٹے اور درمیانہ درجے کے تاجروں، دستکاروں، امیر کسانوں، سرکاری ملازموں اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کے سامنے سرمایہ داری اور کمیونزم کی مذمت کرتے ہوئے "اسلامی نظام حکومت" کو "متوسط راہ" کے طور پر پیش کرتے

ہیں۔ جس طرح اٹلی میں فاشسٹ پارٹی اور جرمنی میں نازی پارٹی کی "متوسط راہ" تنزل کے دور میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کو بزور تشدد قائم رکھنے کی راہ تھی، اسی طرح جماعت اسلامی کی "اسلامی نظام حکومت" بھی تنزل کے دور میں جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو مضبوط و مستحکم رکھنے کی راہ ہے، وہ فاشسٹ نظام حکومت قائم کرنے کی راہ ہے۔

جماعت اسلامی جاگیرداری اور سرمایہ داری کو مضبوط و مستحکم رکھنے کی جدو جہد کر رہی ہے، اس کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ مولانا مودودی وسائل پیداوار کی شخصی ملکیت کو "مستحق احترام" اور سماج میں زرداروں اور ناداروں میں تمیز اور طبقوں کی موجودگی کو "خدا کی بنائی ہوئی فطرت کا تقاضا" اور "نیکی کی شکل" قرار دیتے ہیں، اور اپنی تصانیف میں اگر زرداروں کی مذمت کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ان کی معاشرت و معیشت میں "بے لگامی" نے "کمیونزم کی وبا" بڑھا رہی ہے۔ غرضیکہ مولانا مودودی زرداروں کی مذمت اُن کے دشمن ہونے کے سبب سے نہیں بلکہ دوست اور غمخوار ہونے کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ حقیقی نفرت انہیں وسائل پیداوار کو قومی ملکیت بنانے اور زرداروں کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف عوام کی روٹی، زمین، روزگار، آزادی اور جمہوریت کے لئے جدوجہد سے ہے، چنانچہ عوام کی اس جدوجہد کو وہ "خدا کے بنائے ہوئے فطری قوانین" اور "اسلام کے پاکیزہ اصولوں کے خلاف جنگ" نیز "دہریت" اور "بدی کی شکل" قرار دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ اس "بدی کی شکل" کو مٹانے کے لئے انہوں نے اشتراکیت کے خلاف "فکری اور عملی جنگ" جاری کر رکھی ہے[1]

---

[1] پڑھئے اسلام کا نظام حیات مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی

اشتراکیت کے خلاف جماعت اسلامی کی "فکری اور عملی جنگ" کا مقصد
اگیرداری اور سرمایہ داری کو محفوظ اور مستحکم رکھنے کے لئے مسلمانوں کو
ی آزادی کی تحریکوں سے الگ تھلگ رکھنا ہے۔ "کمیونزم کو اسلام
شمن" قرار دینے، سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان اسلامی نظام
کومت کو "متوسط راہ" کے طور پر پیش کرنے اور خلافت راشدہ
ہد کا نظام حکومت قائم کرنے کی باتیں کرنے کا مقصد یہی ہے۔

کمیونزم اور اسلام کو ایک دوسرے کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش
ن طبقوں کی بہت بڑی عیاری اور عوامی تحریکوں کے خلاف بہت
ی سازش ہے۔ اسلام ایک مذہب ہے اور کمیونسٹ سماج وہ
ج ہے جس میں وسائل پیداوار قوم کی مشترکہ ملکیت ہوں گے جس میں
سرمایہ دار اور مزدور نہیں ہوگا، جس میں کوئی جاگیردار اور مزارعہ
ہوگا۔ جس میں کوئی انسان دوسرے انسان کا اور کوئی قوم دوسری
کی غلام اور محکوم نہیں ہوگی۔ دنیا کی دوسری تمام قوموں کی طرح
مان بھی قبائلی، غلام داری، جاگیرداری اور سرمایہ داری سماج
لیں طے کر کے کمیونسٹ سماج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر قبائلی، غلام
ی، جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام اسلام کے دشمن نہیں تھے تو کمیونسٹ
م بھی نہیں ہے۔

خلافت راشدہ کے عہد کا نظام حکومت عربوں کے سماجی ارتقاء کے
خصوص دور کا پرتو تھا۔ اسے قائم کرنے کے لئے وہی وسائل پیداوار
سماجی ڈھانچہ اور وہی حالات درکار ہیں جو اس زمانہ میں تھے مگر
نہ پرانا سماجی نظام، وہ پرانا پیداوار کا طریقہ اور وہ پرانے پیداوار

کے رشتے دوبارہ قائم نہیں کئے جاسکتے۔ تاریخ اپنے آپ کو کبھی نہیں د
زمانہ پیچھے کی طرف کبھی نہیں دوڑتا۔ ماضی خواہ کتنا ہی شاندار کیوں
ہو، مستقبل کیلئے مینارِ نور کا فریضہ کبھی ادا نہیں کرسکتا۔ پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے آگے پر چلنے
ہمیشہ گرتے اور ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مسلمانوں کے تنزل کا سبب یہی ہے کہ وہ بوس
جاگیرداری نظام سے چمٹے رہے ہیں۔ مستقبل کو روشن بنانے کا انحصار موجو
تاریخی دور کے تقاضوں کو سمجھنے اور شعوری طور پر اُن تقاضوں کے مط
اپنی اقتصادی، سیاسی اور سماجی زندگی کو بدلنے پر ہے۔

سوویٹ یونین کے تقریباً تین کروڑ مسلمانوں نے تاریخی دور کے
تقاضوں کو سمجھا اور سامراجی غلامی سے نجات حاصل کرکے سوش
کی طرف قدم بڑھایا۔ مسلمانوں کی چھ بڑی سوشلسٹ سوویٹ جمہو
(تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، کازخستان، کرغزیہ اور آ
بائیجان) پامیر اور کوہ قاف کے پہاڑوں، دریائے جیحون اور
کی وادیوں، وسط ایشیا کے کہستانوں اور ریگستانوں میں زندگی
ہر شعبہ میں حیرت انگیز ترقی کے احیاء کے نئے دور کا آغاز کرچکی
آزاد مسلمان قوموں کی اس صف میں گذشتہ پانچ سال سے البا
بلغاریہ، رومانیہ، ہنگری اور پولینڈ کے تقریباً ایک کروڑ مسلم
بھی شامل ہوچکے ہیں اور اب ہماری آنکھوں کے سامنے چینی ترک
اور دوسرے چینی صوبوں کے تقریباً چھ سات کروڑ مسلمان
سامراجی غلامی سے آزادی حاصل کرکے سوشلزم کی طرف قدم بڑھ
رہے ہیں غرضیکہ دنیا کے تقریباً چالیس کروڑ مسلمانوں میں سے گیا
کروڑ مسلمان سوشلزم کا راستہ اختیار کرچکے ہیں۔ جدوجہد دیت نا

ملایا اور انڈونیشیا میں بھی ہو رہی ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا
ن ممالک کے تقریباً ۹ کروڑ مسلمان سامراجیوں اور اپنے اپنے
کے رجعت پسند حکمرانوں کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں شریک
یہی حال ہندوستان کے تقریباً تین کروڑ مسلمانوں کا ہے
ت بڑی تعداد میں کمیونسٹوں کی صفوں میں شامل ہو رہے ہیں۔
وجہد پاکستان سمیت باقی تمام مسلمان ممالک کے تقریباً چودہ پندرہ
ر عوام بھی کر رہے ہیں۔ مگر جب تک جاگیرداروں اور سرمایہ داروں
سیاست کا پردہ چاک نہ ہو، ان ممالک کے مسلمان اپنی جدوجہد
میاب ہو کر ترقی کی طرف قدم نہیں رکھ سکتے۔ جماعت اسلامی کی
ست اسلام کے نام پر بوسیدہ جاگیرداری اور زوال پذیر سرمایہ داری
بوط و مستحکم رکھنے کی سیاست ہے۔ پاکستان کے مسلمان اُس
تک تنزل اور تباہی کے دور سے نہیں نکل سکتے جب تک ان کے
دماغ پر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی سیاست مسلط
مسلمان ترقی اُسی صورت میں کر سکتے ہیں جب وہ موجودہ تاریخی
کے تقاضوں کو سمجھ کر ان تقاضوں کے مطابق اپنی اقتصادی
ی اور سماجی زندگی کو شعوری طور پر بدلنے کی جدوجہد کریں۔

مرتضیٰ دواخانہ پریس لاہور

ہماری دوسری کتابیں

ہمارا اشاعتی پروگرام

●

فروری

مودودیات - فیروز الدین منصور . . . . . -/۸

نیا پنجاب - پنجاب کمیونسٹ پارٹی کا انتخابی اعلان نامہ . . . . . . -/۲

جمہوری انتخابات - عبداللہ ملک . . . . . . -/۳

مارچ

اسلامی ملکوں کی سیاست - ذیورا لا لسلام . . -/۸

چین کی نئی جمہوریت - ماؤزے تنگ . . . . -/۸

کسان کمیٹی کا اعلان نامہ - سیکریٹری کسان کمیٹی . -/۲

مہاجروں کا مسئلہ . . . . -/۳

اپریل

انارکزم یا سوشلزم - اسٹالن . . . . . -/۱۲

ترنجن (پنجابی نظموں کا مجموعہ) - احمد راہی . -/۱۲

انقلاب چین اور چینی کمیونسٹ پارٹی - ماؤزے تنگ . -/۳

سوویٹ یونین کا دستور اساسی - اسٹالن . . . -/۱۲

قومی دارالاشاعت

۳ - نسبت روڈ - لاہور

عبدالرؤف نے دوآبہ پریس سے چھپواکر قومی دارالاشاعت سے شائع کی